مسئلہ ملکیت زمین

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مسئلۂ ملکیتِ زمین

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال، لاہور (پاکستان)

جملہ حقوق محفوظ ہیں:

نام کتاب : مسئلۂ ملکیتِ زمین

مصنّف : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اشاعت : اگست ۲۰۰۷ء

ایڈیشن :

تعداد : ۱۱۰۰

اہتمام : پروفیسر محمد امین جاوید (منیجنگ ڈائریکٹر)

اِسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور، پاکستان

فون : 042-7248676-7320961، فیکس: 042-7214974

ویب سائٹ : www.islamicpak.com.pk

ای میل : islamicpak@islamicpak.com.pk

islamicpak@yahoo.com

مطبع :

قیمت :

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ

''اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں''

﴿البقرۃ:۲۸۴﴾

نوٹ: فہرست پر کلک کر کے کسی بھی مضمون تک براہِ راست پہنچا جا سکتا ہے، جبکہ ہر صفحے سے فہرست پر جانے کا لنک موجود ہے۔

فہرستِ مضامین

دیباچہ	۹
۱۔ زمین کی شخصی ملکیت از رُوئے قرآن:	۱۱
ترجمان القرآن کی تنقید	۱۱
مصنّف کا جواب	۱۳
ترجمان القرآن کا جواب الجواب	۱۴
ایک دوسرے اہلِ قلم کی طرف سے مصنف کی تائید	۱۸
ترجمان القرآن کا آخری جواب	۲۱
۲۔ زمین کی شخصی ملکیت از روئے حدیث:	۲۵
اراضی کی چار قسمیں	۲۵
قسمِ اَوّل کا حکم	۲۵
قسمِ دُوُم کا حکم	۲۷
قسمِ سِوُم کے احکام	۲۹
قسمِ چہارُم کے احکام	۳۳
حقوقِ ملکیت بر بنائے آبادکاری	۳۳
عطیۂ زمین من جانب سرکار	۳۷
عطیۂ زمین کے بارے میں شرعی ضابطہ	۳۹
جاگیروں کے معاملہ میں صحیح شرعی رویّہ	۴۱

حقوقِ ملکیت کا احترام	۴۲
۳۔ مزارعت کا مسئلہ	۴۵
رافعؓ بن خدیج کی روایات	۴۵
جابرؓ بن عبداللہ کی روایات	۴۹
مزید تائیدی روایات	۵۱
تنقید بلحاظ نقل وروایت	۵۲
تنقید بلحاظ عقل ودرایت	۶۱
امتناعی احکام کا اصل مفہوم	۶۴
رافعؓ بن خدیج کی توضیحات	۶۴
جابرؓ بن عبداللہ کی توضیح	۶۷
زیدؓ بن ثابت کی توضیح	۶۸
سعدؓ بن ابی وقاص کی توضیحات	۶۸
ابنِ عباسؓ کی توضیحات	۶۹
تحقیقِ مسئلہ	۷۱
فقہا کے مذاہب	۷۲
مذہبِ حنفی کی تفصیل	۷۵
مذہبِ حنبلی	۷۶
مذہبِ مالکی	۷۷
مذہبِ شافعی	۷۷
۴۔ اصلاح کے حدود اور طریقے	۷۹

اِصلاح کے حدود اِربعہ:	۸۱
۱۔قومی ملکیت کی نفی	۸۱
۲۔تقسیمِ دولت میں مساوات کی نفی	۸۲
۳۔ جائز حقوقِ ملکیت کی حرمت	۸۳
۴۔ من مانی قیود کا عدم جواز	۸۴
تدابیر اِصلاح:	۸۵
۱۔ زمین داری و جاگیرداری کا معاملہ	۸۵
۲۔ قانونی زراعت پیشگی کا خاتمہ	۸۶
۳۔ زرعی قوانین کی تدوینِ جدید	۸۶
۴۔ شرعی طریقے پر تقسیمِ میراث	۸۷
۵۔ عشر کی تحصیل و تقسیم کا نظم	۸۸

.....☆☆☆.....

دیباچہ

اب سے پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک مشہور مصنّف کے قلم سے قرآنِ مجید کی تعلیمات پر ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں بہت سی مفید باتوں کے ساتھ کچھ باتیں میرے نزدیک حق کے خلاف بھی تھیں۔ اس پر مَیں نے ماہ نامہ ''ترجمان القرآن'' کے صفحات میں ایک مفصل تنقید لکھی جو ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) کے ابتدائی پرچوں میں شائع ہوئی۔ پھر وہ تنقید ایک مباحثہ کا موضوع بن گئی اور آگے چل کر ملک کے ایک دوسرے اہلِ قلم بھی مصنف کے ساتھ اس بحث میں شریک ہو گئے۔ ایک سال تک یہ مباحثہ ''ترجمان القرآن'' کے صفحات پر جاری رہا جس میں بہت سے مسائل زیرِ بحث آئے۔ من جملہ ان کے ایک یہ مسئلہ بھی تھا کہ زمین کے معاملہ میں اِسلامی قانون کا منشا کیا ہے، آیا وہ اسے اجتماعی ملکیت بنا دینا چاہتا ہے یا افراد کی شخصی ملکیت ہی میں رہنے دیتا ہے؟ اور اگر شخصی ملکیت ہی میں رہنے دیتا ہے تو کیا اسے خود کاشتی کی حد تک محدود کر دینا چاہتا ہے یا مزارعت کی اجازت بھی دیتا ہے؟

یہ مباحثہ ''ترجمان القرآن'' کے فائلوں میں دفن ہو کر رہ گیا تھا۔ اب جو مجھے جیل کی مستقل فرصت نے پچھلے ناتمام کاموں کی تکمیل کا موقع دیا تو پرانے اوراق میں یہ مباحثہ بھی سامنے آیا اور مَیں نے محسوس کیا کہ یہ ایک مفید بحث ہے جس کی ضرورت آج پہلے سے بھی زیادہ ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ اب کی ضروریات کے لیے پہلے کی بحث بہت تشنہ ہے۔ اگر صرف اسی کو جوں

کا توں شائع کیا جائے تو چنداں فائدہ مند نہ ہوگا۔ اس لیے مَیں نے اس پر نظر ثانی کی، جن جن گوشوں میں خلا محسوس ہوا اُنھیں بھرا، اور اس پر بہت سے مزید مباحث کا اضافہ کیا جن کی آج کے لوگوں کو ضرورت ہے۔

اس اِصلاح و اضافہ کے بعد یہ مختصر رسالہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا صرف پہلا باب (ضروری اصلاحات کے ساتھ) اُس مباحثے پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن کے صفحات میں پہلے شائع ہوا تھا۔ باقی ابواب تازہ اضافہ ہیں اور ان کے مخاطب بھی آج ہی کے لوگ ہیں نہ کہ وہ بزرگ جن سے مباحثہ کا آغاز ہوا تھا۔

ابوالاعلیٰ

نیو سنٹرل جیل، ملتان

۹۔ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ (۲۹۔ جنوری ۱۹۵۰ء)

۱

زمین کی شخصی ملکیت از رُوئے قرآن

جیسا کہ دیباچہ میں بتایا جا چکا ہے یہ ایک مباحثہ ہے جس کا آغاز ایک کتاب پر تنقید سے شروع ہوا تھا۔ اس مباحثے میں حسبِ ذیل اجزا شامل ہیں:

(۱) ترجمان القرآن کی تنقید

(۲) مصنّف کا جواب

(۳) ترجمان القرآن کا جواب الجواب

(۴) ایک دوسرے اہلِ قلم کی طرف سے مصنّف کی تائید

(۵) ترجمان القرآن کا آخری جواب

چوں کہ اس بحث کو یہاں نقل کرنے سے مقصود کسی پرانی بحث کو تازہ کرنا نہیں ہے۔ اس لیے نام حذف کر دیے گئے ہیں۔

(۱)

مؤلّف نے سورہ رحمٰن کی آیت: ﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ﴾ سے یہ حکم نکالا ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت یعنی زمین داری ناجائز ہے۔ چنانچہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''زمین کی وراثت کا جہاں جہاں قرآن میں ذکر ہے..... اس کے معنی حکومت کے ہیں۔ شخصی ملکیت یعنی زمین داری کے نہیں ہیں۔ قرآن نے بجز حقِ انتفاع کے زمین پر حقِ ملکیت عطا نہیں کیا ہے۔''

یہاں نکتہ آفرینی کی کوشش میں صاحبِ موصوف صریحًا حق سے تجاوز کر گئے ہیں۔ انھیں غور فرمانا چاہیے تھا کہ زمین کی شخصی ملکیت کا دستور نزولِ قرآن کے وقت تمام دنیا میں رائج تھا، صدیوں سے رائج چلا آ رہا تھا، اور تمدن کے اساسی دستوروں میں داخل تھا۔ اگر قرآن کا مقصود فی الحقیقت یہ ہوتا کہ زمین سے انتفاع کے اس پرانے دستور کو بالکل بدل ڈالا جائے اور شخصی ملکیت کی جگہ قومی ملکیت کا طریقہ رائج کیا جائے تو کیا ایسی انقلاب انگیز بنیادی تبدیلی کے لیے وہی زبان موزوں ہوسکتی تھی جو ﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ﴾ میں استعمال کی گئی ہے؟ ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی اہم اور اساسی اصلاحوں کے لیے محض سرسری اشارے کافی نہیں ہوتے بلکہ صریح احکام دینا ضروری ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی کافی نہیں ہوتا کہ محض سابق دستور کو مٹا دیا جائے، بلکہ اسے مٹانے کے ساتھ خود اپنی طرف سے ایک دوسرا دستور بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ اب کیا جنابِ مصنّف یہ بتا سکتے ہیں کہ قرآن نے شخصی ملکیت کا قاعدہ منسوخ کر کے کون سا دوسرا قاعدہ اس کی جگہ مقرر کیا؟ اور اگر قرآن کا منشا کوئی دوسرا قاعدہ مقرر کرنا ہی تھا تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے شخصی ملکیت کے قدیم دستور کو کیوں باقی رکھا، اور خود لوگوں کو زمینیں کیوں عطا کیں؟

جس آیت سے جنابِ موصوف استدلال فرما رہے ہیں اس کے الفاظ اور سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود کوئی قانون بنانا نہیں ہے، بلکہ خدا کی قدرتوں کا بیان ہے۔ ساری تقریر اس انداز پر ہے:

''رحمٰن نے قرآن کا علم دیا، انسان کو پیدا کیا، اُسے بیان کی قوت دی، اُسی کے حکم سے چاند سورج گردش میں ہیں، درخت اور گل بوٹے سب اُسی کے آگے سربسجود ہیں، اس نے اوپر آسمان کو چھا دیا، اور نیچے خلقت کے فائدے کے لیے زمین بچھا دی جس میں میوے اور کھجور کے درخت ہیں، اور طرح طرح کے اناج اور خوش بُو دار پھول ہیں۔ اب تم اپنے پروردگار کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے؟''

اس تقریر میں تمدنی قانون بیان کرنے کا آخر کون سا موقع تھا؟ اور اس سلسلۂ بیان میں یہ

فقرہ کہ ''نیچے خلقت کے فائدہ کے لیے زمین بچھا دی'' یہ معنی کہاں دیتا ہے کہ زمین پر شخصی ملکیت ناجائز ہے؟ قرآن سے احکام نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ آیت کے الفاظ اور اس کے موقع ومحل اور سیاق وسباق کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ پھر اس امر کا بھی لحاظ کیا جائے کہ جو قانون ہم اس آیت سے اخذ کر رہے ہیں آیا اسے نبی ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں عملاً جاری بھی فرمایا تھا یا نہیں؟ اگر معلوم ہو کہ آپ نے ایسا قانون جاری نہیں فرمایا، بلکہ آپ کا عمل اس کے خلاف رہا تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ بادی النظر میں قرآن کا جو مفہوم ہم سمجھ رہے ہیں وہ غلط ہے۔ کیوں کہ نبی ﷺ اسی لیے بھیجے گئے تھے کہ قرآن میں جو احکام دیے گئے ہیں ان پر عمل کر کے بتائیں اور زندگی کے معاملات میں انھیں جاری کر دیں۔ اگر آپ احکامِ قرآنی کے مطابق زندگی کے قدیم طریقوں میں اصلاح نہ فرماتے اور الٰہی قوانین کو نافذ کرنے کے بجائے پرانے دستوروں کی پیروی کرتے تو نعوذ باللّٰہ آپ کی بعثت بالکل فضول ہوتی، بلکہ بعثت کا اصل منشا ہی فوت ہو جاتا۔ کم از کم اتنا تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ آں حضرت ﷺ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔

(۲)

مُصنّف کا جواب

قرآن سے زمین پر شخصی ملکیت کا حق ثابت نہیں۔ اس پر آپ کو اعتراض ہے تو کوئی آیت ثبوت میں نقل کرتے۔ کسی عہد کی تاریخ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ تاریخ ایک خاص ماحول رکھتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ماحول اب نہ ہو۔ دراصل قرآن کریم کے متعلق ہمارے اور آپ کے زاویۂ نگاہ میں فرق ہے۔ ہم قرآن کو ایک مکمل کتاب سمجھتے ہیں جس میں انسان کے جملہ دینی اور دنیاوی مسائل کا حل ہے۔ جس طرح یہ عالمِ فطرت انسانی معیشت کے لیے ہر طرح مکمل ہے۔ اسی طرح یہ کلامِ فطرت، یعنی قرآن بھی جملہ عقدہ ہائے معاشرت کو کھول سکتا ہے۔ آج انسانی قومیں انسانی معاشرت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بے قرار ہیں اور ان میں قبضۂ زمین کے مسئلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اس کی بدولت انسانی برادری میں نہایت غیر مساویانہ دولت کی تقسیم ہوئی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں اس کا حل نہیں ہے؟ آپ کا خیال ہے کہ

قرآن نے ﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ﴾ کہ کر صرف قدرتِ الٰہی کا اظہار کیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس قدرتِ الٰہی کا شکر یہ ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں۔ اسی سورہ میں ہے: ﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ﴾ (الرحمٰن: ۵۵۔۲۴) یعنی اُسی کے ہیں جہاز اونچے کھڑے ہوئے سمندر میں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی اور جاپانی جہازوں کو سمندر میں دیکھ کر آپ قدرتِ حق پر اس کی حمد وثنا کریں یا خود بڑے بڑے جنگی جہاز تعمیر کر کے سمندر میں ڈالیں؟ بہرصورت کلامِ الٰہی ایک فطری شے ہے جس کے منافع محدود اور متعین نہیں ہوتے۔ اس لیے کسی آیت کے متعلق آپ کا یہ کہنا کہ یہ صرف فلاں غرض کے لیے ہے صحیح نہیں ہوسکتا۔ اگر اس سے دوسرے فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں تو ضرور حاصل کیے جائیں گے۔ یہی حال فطری اشیا کا ہے۔ باوا آدم پانی کے متعلق یہ تو ضرور جانتے تھے کہ نہانے اور پینے کی چیز ہے۔ مگر فرزندانِ آدمؑ نے اسی پانی سے بڑی بڑی مشینیں، ریلیں اور جہاز چلانا شروع کیے۔ اور ابھی تک اس کا فائدہ محدود نہیں ہے۔ اسی سے ''ماءِ ثقیل'' نکالا جاچکا ہے جو دنیا کا سب سے قیمتی زہر ہے اور اسی سے پٹرولیم بنانے کا نسخہ بھی تیار ہو چکا ہے۔ بعینہٖ یہی حال آیاتِ قرآنی کا ہے کہ ان کی فہم کو کسی ایک عہد کے ساتھ مخصوص کر دینا روا نہیں ہے۔ وہ ہر عہد میں ایک نیا عالم پیدا کرسکتی ہیں۔

(۳)

''ترجمان القرآن'' کا جواب الجواب

آپ نے اس مسئلہ میں خلطِ مبحث کر دیا اور میرے اعتراض کا کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے ﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ﴾ سے یہ مسئلہ نکالا تھا کہ اس آیت کی رُو سے زمین کی شخصی ملکیت جائز نہیں ہے۔ اس پر میرا اعتراض دو پہلوؤں سے تھا۔

ایک یہ کہ نظامِ تمدن میں ایسی انقلاب انگیز بنیادی تبدیلی کہ زمین کو اشخاص وافراد کی مِلک سے نکال کر اجتماعی ملک بنا دیا جائے، اگر فی الحقیقت قرآن کے پیشِ نظر ہوتی اور یہی اس کا منشا ہوتا تو وہ اسے محض اُس طرح کے اشاروں میں بیان نہ کرتا جن سے آپ یہ مضمون نکال رہے ہیں بلکہ وہ صاف صاف الفاظ میں پرانے دستور کو بند کرنے کا حکم دیتا اور آیندہ کے لیے واضح طور

پر تا تا کہ زمین سے انتفاع کی کیا صورت وہ رائج کرنا چاہتا ہے۔

دُوسرے یہ کہ اگر قرآنِ مجید کا منشا یہی تھا تو آں حضرت ﷺ نے اس کے مطابق عمل کیوں نہیں کیا؟ آں حضرت ﷺ کی بعثت کا تو اصل مقصد ہی یہ تھا کہ عقائد، اَخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، غرض انسانی زندگی کے ہر شعبے کو قرآنی احکام کے مطابق ڈھال کر دُنیا کو اِسلامی نظام کا نمونہ عملاً دکھا دیں۔ ظاہر ہے کہ آں حضور ﷺ حالات کی بندگی کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ خدا کی بندگی کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ آپؐ کا کام دنیا کی روش پر چلنا نہ تھا، بلکہ دُنیا کی روش کو بدل کر قرآن کی بتائی ہوئی روش پر چلانا تھا۔ اب اگر ایک طرف آپؐ کے قول کے مطابق یہ مان لیا جائے کہ قرآن کا مقصد زمین کی شخصی ملکیت کو مٹانا تھا، اور دوسری طرف اس ناقابلِ انکار حقیقت کی طرف نظر کی جائے کہ رسول اللّٰہ ﷺ نے ملکیتِ شخصی کے پرانے نظام کو مٹایا نہیں بلکہ اسی کو برقرار رکھا، تو لامحالہ دو باتوں میں سے ایک بات ماننا پڑے گی۔ یا یہ کہ قرآن کے اس مقصد سے آں حضرت ﷺ خود بے خبر تھے۔ یا یہ کہ حضور ﷺ کو اس کا علم تھا مگر آپؐ نے قرآن کے اِس حکم پر عمل نہ کیا اور قرآن کے بتائے ہوئے دستور پر اس دستور کو ترجیح دی جو رضائے الٰہی کے خلاف دنیا میں رائج چلا آ رہا تھا۔ فرمایئے، ان دونوں پہلوؤں میں سے کون سا پہلو آپ اختیار کرتے ہیں؟

یہ تھے میرے اعتراضات، مگر آپ نے ان کی طرف سرے سے کوئی توجہ ہی نہ فرمائی اور قرآن کے متعلق اپنے زاویۂ نگاہ کی تشریح شروع کر دی۔ اس پر بھی صبر کیا جا سکتا تھا اگر آپ کی اس تشریح سے معاملہ کچھ سلجھ جاتا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نے معاملہ کو اور زیادہ اُلجھا دیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ ''ہم قرآن کو ایک مکمل کتاب سمجھتے ہیں۔'' بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر ایسی مکمل کتاب تصنیف کرنے کی یہ سزا تو اللّٰہ تعالیٰ کو نہ دیجیے کہ اس کی آیتوں، اور آیتوں کے بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ان کے سیاق وسباق سے الگ کر کے انھیں وہ معنی پہنانا شروع کر دیں جو نہ صرف اُس سلسلۂ کلام سے، بلکہ پورے قرآن کی تعلیم ہی سے کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ یہ طریقۂ تعبیر و تاویل دنیا کی کسی تقریر و تحریر اور کسی عبارت کے معاملہ میں بھی صحیح نہیں ہے، کجا کہ خدا

کی کتاب کو اس کا تختۂ مشق بنایا جائے۔ اگر میں آپ ہی کے مضمون میں سے کسی فقرے کو الگ نکال کر اس سے معنی نکالنے کا وہ طریقہ برتوں جو آپ نے قرآن سے معنی نکالنے کے لیے اختیار فرمایا ہے، تو آپ خود پکار اٹھیں گے کہ یہ مجھ پر اور میری تحریر پر ظلم ہے۔ کلامِ الٰہی تو بے شک کلامِ فطرت ہے، مگر اس کی تفسیر کا جو طریقہ آپ نے اختیار فرمایا ہے وہ تو یقیناً خلافِ فطرت ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ انسانی معاشرت کے مسائل میں قبضۂ زمین کے مسئلے کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ اس کی بدولت انسانی برادری میں دولت کی تقسیم نہایت غیر مساویانہ طریقہ پر ہوئی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کا حل قرآن نے کیا ہو۔ بالکل بجا ہے۔ واقعی یہ مسئلہ زندگی کے مسائل میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بڑی معقول بات ہے کہ اس کا حل معلوم کرنے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کیا جائے۔ مگر اس کے لیے معقول طریقِ کار یہ ہے کہ آپ خود قرآن ہی سے پوچھیں کہ تقسیمِ دولت کے متعلق اس کا نظریہ کیا ہے۔ وہ مساویانہ تقسیم کرنا چاہتا ہے یا منصفانہ؟ وہ غیر مساویانہ تقسیم کو مٹانا چاہتا ہے یا غیر منصفانہ تقسیم کو؟ پھر جو بھی اس کا نظریہ ہے اس کے لحاظ سے وہ زمین کے بارے میں شخصی ملکیت کے پرانے دستور کو بالکل بدل ڈالنا چاہتا ہے یا اسے برقرار رکھ کر اس کے اندر کوئی اصلاح تجویز کرتا ہے؟ ان مسائل کا کوئی جواب اپنی طرف سے قرآن کے منہ میں ڈالنے کی بجائے آپ کو یہ تحقیق کرنا چاہیے کہ اس کا اپنا جواب کیا ہے۔ اس کے جواب پر آپ کا اطمینان ہو تو اسے قبول کیجیے۔ نہ اطمینان ہو تو اسے رَدّ کر دیجیے جو دوسرا حل آپ کے نزدیک صحیح ہو اس کی تبلیغ کیجیے اور صاف صاف کہیے کہ قرآن کا حل میرے نزدیک غلط ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ حل میرے نزدیک صحیح ہے۔ لیکن اس معقول طریقہ کی بجائے آپ دولت کی تقسیم کا نظریہ اور طریقہ تو لیتے ہیں مارکس اور لینن سے، اور پھر زبردستی اسے لا کر ڈالتے ہیں قرآن میں، اور اس طرح دُنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اشتراکیت کا نظریہ نہیں بلکہ قرآن کا نظریہ ہے۔ اس صریح زیادتی پر کوئی آپ کو ٹوکتا ہے تو آپ اسے یہ لیکچر دیتے ہیں کہ باوا آدم کے زمانہ میں پانی کا استعمال کسی اور طرح ہوتا تھا اور اب کسی اور طرح ہوتا ہے، اس وجہ سے قرآن کا طریقِ استعمال بھی اب بدل کر کچھ سے کچھ ہو گیا ہے!

آپ کا ارشاد ہے کہ بے شک سورۂ رحمٰن میں تو ﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ﴾ کا فقرہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے اظہار ہی کے لیے فرمایا ہے، مگر ہمارے نزدیک اس قدرتِ الٰہی کا شکریہ یہ ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں،'' یعنی ساری زمین کو سب ''انام'' (مخلوقات) کی مشترک ملکیت بنا دیں[1]۔ بڑے ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ اگر آیاتِ قرآنی میں تصرف کا یہ تکلف دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہی کو مٹانے کے لیے فرمایا گیا ہے تو اس مقصد کے لیے سورۂ رحمٰن کی اس آیت کی بجائے سورۂ بقرہ کی وہ آیت اچھی تختۂ مشق ثابت ہو سکتی تھی جس میں اللہ تعالیٰ یہ کہہ گزرے ہیں کہ:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا.

''پیدا کیا تمھارے لیے وہ سب کچھ جو زمین میں ہے۔''

اس آیت پر اگر آپ اپنا طریقِ تفسیر استعمال فرماتے تو اس سے یہ حکم نکل سکتا تھا کہ نہ صرف زمین بلکہ روپیہ، پیسہ، (جس میں آپ نے بھولے سے قانونِ میراث کے اجرا کو تسلیم کر لیا ہے)، روٹی، کپڑا، برتن، جانور (جن پر شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرنے کی غلطی بھی آپ سے سرزد ہو گئی ہے) مکان، سواری غرض سب ہی کچھ شخصی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے۔ اس تدبیر سے ایک ہی دَہلا میں دولت کی غیر مساوی تقسیم کا قصہ بھی پاک ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ کا شکریہ بھی اَدھورا نہ رہ جاتا۔

آپ کا یہ نظریہ بھی بڑا ہی عجیب و غریب ہے کہ قرآن کا منشا متعین کرنے کے لیے نبی ﷺ کے عمل کو فیصلہ کن نہ مانا جائے۔ مَیں نے جو عرض کیا تھا کہ ہمیں کسی آیت سے کوئی قانون اخذ

---

[1] زیرِ تنقید کتاب کے مصنف کا اجتہاد تو اب کئی سال پرانا ہو چکا ہے۔ آج کل کے اشتراکیت زدہ مجتہدینِ اسلام نے قرآن سے ایک اور فقرہ ڈھونڈ نکالا ہے ﴿اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ﴾ اور اس پر انھوں نے قیاسات کا ایک پورا ''کریملن'' تعمیر کر ڈالا ہے۔ حالانکہ وہ پوری آیت جس میں سے یہ ٹکڑا نکالا گیا ہے ان کے منشا کے بالکل برعکس معنی دے رہی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: ﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ (الاعراف: ۱۲۸) ''زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔'' پھر اگر بالفرض قرآن میں صرف اتنا ہی فقرہ ہوتا کہ اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ، تب بھی تو اسے یہ معنی پہنانے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ زمین افراد کی ملکیت نہ ہو بلکہ قوم یا اسٹیٹ کی ملکیت ہو۔ اس طرح کی من مانی تاویلیں کرنے پر کوئی اُتر آئے تو کہہ سکتا ہے کہ سرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت نہ ہونی چاہیے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے صاف کہہ دیا ہے کہ ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔''

کرتے ہوئے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ نبی ﷺ کے زمانہ میں اس پر عمل درآمد ہوا ہے یا نہیں، اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ ''کسی عہد کی تاریخ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔'' یہ جواب ارشاد فرماتے وقت شاید آپ نے غور نہیں کیا کہ اس کے منطقی نتائج کیا ہیں۔ اگر ہم ایک طرف یہ بات مان لیں کہ قرآن کا اصل منشا زمین کو شخصی ملکیتوں سے نکال کر اجتماعی ملکیت بنا دینا تھا، اور دوسری طرف اس امرِ واقعہ کو دیکھیں کہ یہ کام نہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانۂ حکومت میں کیا، نہ خلفائے راشدین نے اپنے دَور میں کیا، نہ صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین اور پچھلے تیرہ سو برس کے فقہاء امت میں سے کسی نے اس کا خیال تک ظاہر کیا، تو لامحالہ پھر ہمیں دو باتوں میں سے ایک بات ماننا پڑے گی۔ یا تو یہ کہ قرآن کو اس کے لانے والے پیغمبر سے لے کر پوری امت مسلمہ کے علما و فقہا اور ائمہ تک کسی نے نہ سمجھا، اور اس کے فہم کی سعادت نصیب ہوئی تو مارکس، اینجلز، لینن اور اسٹالین کو ہوئی۔ یا پھر قرآن کے منشا کو سمجھ تو گئے تھے رسولؐ اور صحابہ بھی، مگر عمل کی توفیق ان کی بجائے روس کے اشتراکی کامریڈوں کو نصیب ہوئی! قرآن کے منشا کا مسئلہ عہد رسالت کی تاریخ سے حل نہ ہوگا تو پھر وہ یوں حل ہوگا۔ کیا واقعی آپ اس پر راضی ہیں؟

ایک دُوسرے اہلِ قلم کی طرف سے مصنّف کے نظریہ کی تائید

اس میں تو شک نہیں کہ صاحبِ تعلیمات نے جس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے وہ اساسی قانون کی بظاہر حامل نظر نہیں آتی لیکن اس کے خلاف ملکیتِ زمین کی تائید میں بھی تو کوئی آیت آپ نے نقل نہیں فرمائی۔ اب اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ہی قولِ فیصل ہوگا۔ میری محدود نظر نے جہاں تک کام کیا ہے، مَیں تو دیکھتا ہوں کہ احادیث مقدسہ سے بھی صاحبِ تعلیمات کی اس تاویل کی تائید ہو رہی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری شریف میں یہ روایات ہیں۔

(کتاب المزارعہ باکراء الارض)

(۱) **عن رافع بن خدیج ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم نھٰی عن کراء الارض.**

''حضرت رافع بن خدیج سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کا لگان لینے سے منع فرمایا۔''

(۲) **عن جابرٍ قال کانوا یزرعونھا بالثلث والربع والنصف فقال النبی**

صلی اللّٰہ علیہ وسلم من کانت لہ ارض فلیزرعھا اولیمنحھا.

''حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم زمین کو تہائی، چوتھائی اور نصف کی بٹائی پر دے دیا کرتے تھے۔ سو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود جوتے یا دوسرے کو دے دے۔''

(۳) عن ابی ھریرۃ قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من کانت لہ ارض فلیزرعھا اویمنحھا اخاہٗ.

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس کوئی زمین ہو وہ خود اسے جوتے یا اسے اپنے بھائی کو دے دے۔''

اس کے علاوہ رافعؓ بن خدیج ہی سے ایک اور روایت ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ ان کے چچا زمین کو پیداوار کی چوتھائی اور چند وسق کھجور، اور جَو کے عوض دے دیا کرتے تھے سو نبی اکرم ﷺ نے انھیں اس سے منع فرمایا اور فرمایا خود کاشت کرو یا دوسرے کو کاشت کے لیے دے دو یا روکے رکھو۔''

اس کے ساتھ ہی حضرت ابنِ عمرؓ کا یہ واقعہ بھی بخاری میں درج ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ سے لے کر حضرت معاویہؓ کے ابتدائی زمانے تک زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے اس وقت انھیں رافعؓ بن خدیج کی روایت کردہ حدیث پہنچی۔ انھوں نے رافعؓ بن خدیج سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ واقعی نبی اکرم ﷺ نے زمین کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے بعد اپنی زمینیں کرایہ پر دینا موقوف کر دیں۔

ممکن ہے مَیں ان احادیثِ مقدسہ کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکا ہوں۔ اس لیے اس کے متعلق بھی وضاحت فرما دیجیے لیکن اگر ان کا یہی مفہوم ہے جو بظاہر معلوم ہوتا ہے تو ان تصریحات کی روشنی میں صاحبِ تعلیمات عدمِ ملکیتِ اراضی کے نتیجہ پر پہنچ جائیں تو میرا خیال ہے کہ انھیں محض اشتراکیت کے خیال سے مرعوب تصور کر لینا درست نہ ہوگا۔ اشتراکیت کے ثبوت میں تو بخاری شریف کی اس حدیث کو اور بھی قوی دلیل سے پیش کر سکتے ہیں جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

نحن لا نورث ما ترکنا صدقۃٌ

''ہم (انبیا) سے وراثت نہیں ملتی ہے۔ ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں صدقہ ہے۔''

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام حضرات انبیائے کرام اس حد تک فطرتاً کمیونسٹ تھے[1]۔

---

[1] یہ ایک غیر متعلق بحث ہے جو محترم ناقد نے یہاں چھیڑ دی ہے، اس لیے ہم اس پر اصل مباحثے کے سلسلے میں تو گفتگو نہیں کر سکتے۔ لیکن اس اندیشے سے کہ خواہ مخواہ کا ایک شُبہ لوگوں کے دلوں میں نہ پڑ جائے حاشیے میں اسے مختصراً صاف کیے دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ نبی ﷺ اپنی ذاتی املاک اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت کو تو نبوت کے ابتدائی دس گیارہ سال میں خرچ کر چکے تھے، اور تبلیغِ دین کی مصروفیت نے آپ کے لیے اس امر کا بھی کوئی موقع باقی نہ چھوڑا تھا کہ اپنی کسبِ معاش کے لیے کچھ کر سکیں۔ اس کے بعد مکہ کے آخری اور مدینہ کے ابتدائی دَور میں آپ کی معیشت کا انحصار اُن فتوح پر رہا جو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے آپ کو عطا کرتا تھا۔ پھر جب اِسلامی حکومت کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک طرح حکم ران کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے بنی نضیر کی فَے میں آپ کا حصہ مقرر فرما دیا، اور دوسری طرف خیبر اور فدک کی زمینوں میں، جنھیں مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کیا گیا تھا، دوسرے شرکائے جنگ کے ساتھ آپ کو بھی حصہ ملا، ان میں سے پہلے حصے کے متعلق حضور ﷺ نے جو ہدایت فرمائی وہ یہ تھی کہ:

ان اللّٰہ اذا اطعم نبیا طعمۃ فھی للذی یقوم من بعدہ. (ابوداؤد)

''یعنی اللہ تعالیٰ کسی نبی کو بسر اوقات کے لیے جو ذریعۂ معاش عطا کرتا ہے وہ اس کے بعد اُس شخص کا حصہ ہے جو اس کی جگہ اس کا کام سنبھالے۔''

اور دوسرے حصے کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا:

نحن لا نورث، ما ترکنا صدقۃ.

''ہم لوگ وراثت نہیں چھوڑا کرتے، جو کچھ بھی ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔'' (بخاری)

اس کی وجہ ذرا سا غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضور ﷺ نے اسے صدقہ کیوں کر دیا اور پچھلے تمام انبیا کا طریقہ یہ کیوں رہا ہے کہ نبوت کے زمانے کی کمائی کو وہ صرف بسر اوقات ہی کا ذریعہ بناتے تھے، ذاتی ملک بنا کر میراث میں منتقل نہ کرتے تھے۔ انبیا علیہم السلام کو جس ناؤک منصب پر اللہ تعالیٰ قائم کرتا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی اپنی ذات ایسے ہر شبہ سے بالاتر رہے کہ وہ یہ کام اپنی کسی ذاتی غرض سے کر رہے ہیں۔ اسی لیے ہر نبی کی زبان سے اللہ تعالیٰ یہ اعلان کراتا تھا:

لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ.

''میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو صرف اللہ کے ذمہ ہے۔''

پس حضور ﷺ کا یہ صدقہ اس بنیاد پر تھا کہ آپ زمانۂ رسالت کی کمائی کو اجرِ رسالت بنانا پسند نہ فرماتے تھے۔ اس چیز کو ''کمیونزم'' سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

(۵)

ترجمان القرآن کا آخری جواب

آپ تسلیم کرتے ہیں کہ مصنف نے جس آیت سے ملکیتِ زمین کا عدم جواز ثابت کرنا چاہا ہے، وہ کوئی قانون بنانے والی آیت نہیں ہے، لیکن اس کے بعد آپ مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ملکیتِ زمین کے جواز ہی میں کوئی آیت پیش کرو۔ قبل اس کے کہ مَیں آپ کے اس مطالبہ کو پورا کروں، مَیں یہ قاعدۂ کلیہ آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جب کسی رواجِ عام کے متعلق سکوت اختیار کیا جائے تو اُسے ہمیشہ رضا اور جواز ہی پر محمول کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر کسی جگہ لوگوں نے کسی زمین کو گزرگاہ بنا رکھا ہو، اور وہاں کوئی نوٹس اس فعل کی ممانعت کے لیے نہ لگایا گیا ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہاں راستہ چلنا جائز ہے۔ اس جواز کے لیے کسی اثباتی اجازت کا ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ وہاں ممانعت کا نہ ہونا خود ہی اجازت کا مفہوم پیدا کر رہا ہے۔ اسی طرح زمین کی ملکیت کا مسئلہ بھی ہے۔ اِسلام سے پہلے ہزاروں سال سے دنیا میں یہ دستور جاری تھا۔ قرآن نے اس کی ممانعت نہ کی۔ کوئی صریح حکم اس کے موقوف کرنے کے لیے نہ دیا۔ کوئی دوسرا قانون اس کی جگہ لینے کے لیے نہ بنایا۔ کہیں اشارۃً اس رواج کی مذمت تک نہ کی۔ اس کے معنی یہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پرانے دستور کو جائز رکھا، اور یہی معنی لے کر مسلمان نزولِ قرآن کے بعد سے اب تک زمین کو اُسی طرح شخصی ملکیت بناتے رہے جس طرح اس سے پہلے وہ شخصی ملکیت بنائی جاتی رہی تھی۔ اب اگر کوئی اس کے عدم جواز کا قائل ہے تو اسے عدم جواز کا ثبوت دینا چاہیے، نہ یہ کہ وہ ہم سے جواز کا ثبوت مانگے۔

لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ قرآن نے پرانے دستور کو موقوف نہیں کیا بلکہ اگر آپ قرآن کا غائر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نے ایجابًا اسے جائز تسلیم کیا ہے اور اُسی کی بنیاد پر معیشت اور معاشرت کے متعلق احکام دیے ہیں۔

دیکھیے، زمین سے انسان کی دو ہی اغراض وابستہ ہیں، یا زراعت، یا سکونت، قرآن ان دونوں اغراض کے لیے زمین کی شخصی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے:

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ. (الانعام ۶:۱۴۱)

''اس کے پھلوں میں سے کھاؤ جب کہ وہ پھل لائے اور اس کی فصل کٹنے کے دن اس کا (یعنی خدا کا) حق ادا کرو۔''

یہاں خدا کا حق ادا کرنے سے مراد زکوٰۃ وصدقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر زمین اجتماعی ملکیت ہوتو نہ زکوٰۃ دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ لینے کا۔ یہ حکم صرف اسی بنیاد پر دیا جا سکتا تھا جب کہ کچھ لوگ زمین کے مالک ہوں اور وہ اس کی پیداوار میں سے خدا کا حق نکالیں، اور کچھ دوسرے لوگ زمین کے مالک نہ ہوں، اور انھیں پیداوار کا وہ حصہ دیا جائے جو خدا کے لیے نکالا گیا ہو۔ فرمایئے، یہ حکم دے کر قرآن نے ملکیت زمین کے پرانے نظام کی توثیق کی یا نہیں؟ اسی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَاکَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَالَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ.

''اے ایمان لانے والو! خرچ کرو اپنی پاک کمائیوں میں سے اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔''

یہاں زمین کی پیداوار میں سے خرچ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ وخیرات ہے۔ اس حکم کی بجا آوری وہی شخص کرے گا جو پیداوار کا مالک ہوگا، اور انھی لوگوں پر یہ انفاق کیا جائے گا جو صاحبِ مال وجائداد نہیں ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ خیرات کے مستحق کون ہیں:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَایَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ.

(البقرہ۲:۲۷۳) اور **اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ..... الخ** (التوبہ:۶۰)

رہی دوسری غرض تو اس کے متعلق سورۂ نور میں ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَدْخُلُوْ بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰی اَھْلِھَا..... فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْھَا اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْھَا حَتّٰی یُؤْذَنَ لَکُمْ.

(النور:۲۷۔۲۸)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ پوچھ نہ لو، اور جب داخل ہو تو اس گھر والوں کو سلام کرو..... اور اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو اندر نہ جاؤ تاوقتیکہ تمھیں ایسا کرنے کی اجازت نہ دی گئی ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سکونت کے لیے بھی زمین کے شخصی قبضہ و ملکیت کی توثیق کرتا ہے اور ایک مالک کے اس حق کا استقرار کرتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کی اجازت کے بغیر اس کے حدود میں قدم نہ رکھے۔

اب حدیث کی طرف آیئے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے قرآن کے منشا کی تعیین میں رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو قولِ فیصل تسلیم کیا ہے۔ مگر اس بات پر تعجب بھی ہوا کہ جو حدیثیں آپ نے نقل فرمائی ہیں انھیں آپ حضرت مصنف کی تاویل کا مؤیّد قرار دے رہے ہیں، حالانکہ وہ سب زمین کی شخصی ملکیت کو ثابت کر رہی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا منشا بھی یہ نہیں ہے کہ زمین کو افراد کے قبضے سے نکال کر اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے، البتہ ان احادیث کی بِنا پر یہ غلط فہمی ضرور پیدا ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے کرایۂ زمین (یعنی لگان) اور مزارعت (یعنی بٹائی) سے منع فرمایا ہے، اور یہ کہ حضورؐ کا منشا یہ تھا کہ ہر شخص کے پاس بس اتنی ہی زمین رہے جسے وہ خود کاشت کر سکتا ہو، لیکن جیسا کہ مَیں عن قریب بتاؤں گا، یہ غلط فہمی بھی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی کسی جگہ سے چند حدیثیں نکال کر اُن سے ایک معنی اخذ کر بیٹھتا ہے۔ ورنہ اگر بحیثیتِ مجموعی اس مسئلہ میں نبی ﷺ کے تمام ارشادات، اور آپ کے عہد کے عمل، اور زمانۂ خلفائے راشدینؓ کے عمل کو دیکھا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ عہدِ نبوت سے قریب زمانہ کے ائمہ نے قرآن، حدیث، اور آثارِ صحابہؓ پر جامع نگاہ ڈال کر زمین کے بارے میں اِسلام کا قانون کیا سمجھتا تھا، تو اس امر میں قطعًا کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ اِسلام صرف یہی نہیں کہ زمین کی شخصی ملکیت کو جائز رکھتا ہے،، بلکہ وہ اس ملکیت پر کوئی حد بھی نہیں لگاتا، اور مالک زمین کو یہ حق دیتا ہے کہ جس زمین کو وہ خود کاشت نہ کرتا ہو، اسے وہ دوسرے کو مزارعت یا کرایہ پر دے دے۔

آیئے اب ذرا ہم اس مسئلے میں اِسلامی قانون کے اصل مآخذ کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں۔

.....☆☆☆.....

۲

زمین کی شخصی ملکیت از رُوئے حدیث

نبی ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد میں زمین کا انتظام کس طریقے پر کیا گیا تھا، اسے سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ شریعت کی رُو سے اِسلامی حکومت کے زیرِ حکم آنے والی اراضی چار بڑی اقسام پر منقسم ہوتی ہیں:

(۱) وہ جن کے مالک اِسلام قبول کر لیں۔

(۲) وہ جن کے مالک اپنے دین ہی پر رہیں مگر ایک معاہدے کے ذریعہ سے اپنے آپ کو اِسلامی حکومت کی تابعیت میں دیں۔

(۳) وہ جن کے مالک بزورِ شمشیر مغلوب ہوں۔

(۴) وہ جو کسی کی ملک میں نہ ہوں۔

اِن میں سے ہر ایک کے متعلق آں حضرت ﷺ اور آپؐ کے خلفاءؓ نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا، اسے ہم الگ الگ بیان کریں گے۔

قسمِ اوّل کا حکم

پہلی قسم کی املاک کے معاملہ میں نبی ﷺ نے جس اصول پر عمل فرمایا وہ یہ تھا:

اِنَّ القوم اذا اسلموا احرز وا دماء ھم واموالھم.

(ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی اقطاع الارضین)

''جب لوگ اِسلام قبول کر لیں تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیتے ہیں۔''

انه من اسلم علٰی شی ءٍ فھو لهٗ. (کتاب الاموال، لابی عبید)

''آدمی اِسلام قبول کرتے وقت جن املاک کا مالک تھا وہ اُسی کی مِلک رہیں گی۔''

یہ اُصول جس طرح املاکِ منقولہ پر چسپاں ہوتا تھا اسی طرح غیر منقولہ پر بھی چسپاں ہوتا تھا، اور اس معاملہ میں جو برتاؤ غیر زرعی جائدادوں کے ساتھ تھا وہی زرعی جائدادوں کے ساتھ بھی تھا۔ حدیث اور آثار کا پورا ذخیرہ اس پر شاہد ہے کہ آں حضرت ﷺ نے عرب میں کسی جگہ بھی اِسلام قبول کرنے والوں کی املاک سے ذرّہ برابر کوئی تعرض نہیں فرمایا۔ جو جس چیز کا مالک تھا اسی کا مالک رہنے دیا گیا۔ اس باب میں اِسلامی قانون کی تشریح امام ابو یوسف رحمۃ اللّٰہ علیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جو لوگ اِسلام قبول کر لیں اُن کا خون حرام ہے۔ قبولِ اِسلام کے وقت جن اموال کے وہ مالک ہوں وہ انھی کی مِلک رہیں گے۔ اسی طرح ان کی زمینیں بھی اُنھی کی مِلک رہیں گی اور وہ زمینیں عشری قرار دی جائیں گی۔ اس کی نظیر مدینہ ہے جس کے باشندوں نے رسول اللّٰہ ﷺ کے ہاتھ پر اِسلام قبول کیا اور وہ اپنی زمینوں کے مالک رہے اور اُن پر عُشر لگا دیا گیا۔ ایسا ہی معاملہ طائف اور بحرین کے لوگوں سے بھی کیا گیا۔ اسی طرح بدویوں میں سے بھی جن جن لوگوں نے اِسلام قبول کیا وہ اپنے اپنے چشموں اور اپنے اپنے علاقوں کے مالک تسلیم کیے گئے..... اُن کی زمین عشری زمین ہے۔ وہ اس سے بے دخل نہیں کیے جا سکتے، اور انھیں اس پر بیع اور وراثت کے جملہ حقوق حاصل ہیں۔ بالکل اسی طرح جن علاقوں کے باشندے اِسلام قبول کر لیں وہ اپنی املک کے مالک رہیں گے۔'' (کتاب الخراج، ص ۳۵)

اِسلامی قانونِ معیشت کے دوسرے جلیل القدر محقق امام ابو عبید القاسم بن سلام لکھتے ہیں:

''رسول اللّٰہ ﷺ اور آپ کے خلفا سے جو آثار ہم تک پہنچے ہیں وہ اراضی کے بارے میں تین قسم کے احکام لائے ہیں۔ ایک قسم ان اراضی کی جن کے مالک اِسلام قبول کر لیں۔ تو قبولِ اِسلام کے وقت وہ جن اراضی کے مالک ہوں وہ اُنھی کی مِلک رہیں گی اور وہ عشری زمینیں قرار پائیں گی۔ عشر کے سوا ان پر اور کچھ نہ لگے گا.....''

(کتاب الاموال، ص ۵۵)

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:

''جس علاقے کے باشندے اِسلام لے آئے وہ اپنی زمینوں کے مالک رہے، جیسے مدینہ، طائف، یمن اور بحرین۔ اسی طرح مکہ اگرچہ بزورِ شمشیر فتح ہوا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کے باشندوں پر احسان کیا اور ان کی جانوں سے تعرض نہ کیا اور ان کے اموال کو غنیمت نہ ٹھہرایا..... پس جب ان کے اموال ان کی مِلک میں چھوڑ دیے گئے اور اس کے بعد وہ مسلمان ہو گئے تو ان کی املاک کا حکم بھی وہی ہو گیا جو دوسرے مسلمان ہونے والے لوگوں کی املاک کا تھا، اور ان کی زمینیں بھی عشری قرار دی گئیں۔ (ص۵۱۲)

علامہ ابنُ القیم رحمۃ اللہ علیہ ''زاد المعاد'' میں لکھتے ہیں:

''نبی ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص اِسلام لانے کے وقت جس چیز پر قابض تھا وہ اسی کے قبضہ میں رہنے دی گئی۔ یہ نہیں دیکھا گیا کہ اِسلام لانے سے پہلے وہ چیز کس ذریعہ سے اس کے قبضہ میں آئی تھی۔ بلکہ وہ اس کے ہاتھ میں اسی طرح رہنے دی گئی جس طرح وہ پہلے سے چلی آ رہی تھی۔'' (جلد۲، ص۹۶)

یہ ایک ایسا قاعدۂ کلیہ ہے جس میں استثناء کی کوئی ایک مثال بھی عہدِ نبوت اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے نظائر میں نہیں ملتی۔ اِسلام نے اپنے پیروؤں کی معاشی زندگی میں جو اصلاحیں بھی جاری کیں آیندہ کے لیے کیں، مگر جو ملکیتیں پہلے سے لوگوں کے قبضے میں چلی آ رہی تھیں ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔

قسمِ دُوُم کا حکم

دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جنھوں نے اِسلام تو قبول نہ کیا، مگر مصالحانہ طریقہ سے اِسلامی حکومت کے تابع بن کر رہنا قبول کر لیا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جو اصول نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا وہ یہ تھا کہ جن شرائط پر بھی ان سے مصالحت ہوئی ہو انھیں بے کم و کاست پورا کیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں آپ کا ارشاد ہے:

لعلکم تقاتلون قومًا فیظھرون علیکم فیتقون باموالھم دون انفسھم

وابناء هم فتصالحونهم علیٰ صلح فلا تصیبوا منهم فوق ذالک فانه لایصلح. (ابوداؤد، ابنِ ماجہ)

''اگر کبھی ایسا ہو کہ کسی قوم سے تمھاری جنگ ہو، پھر وہ تمھارے سامنے آ کر اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانیں بچانے کے لیے اپنے مال دینے پر تیار ہو جائیں، اور تم ان سے صلح کر لو، تو ایسی صورت میں جس چیز پر ان سے تمھاری صلح ہو اس سے زائد کچھ نہ لینا کیوں کہ وہ تمھارے لیے جائز نہیں ہے۔''

الا من ظلم معاهدا او انتقصه او کلفه فوق طاقته او اخذ منه شیئًا بغیر طیب نفس فانا حجیجه یوم القیامة. (ابوداؤد)

''خبردار رہو، جو شخص کسی معاہد ذمی پر ظلم کرے گا، یا ازروئے معاہدہ اس کے جو حقوق ہوں ان کے اندر کوئی کمی کرے گا، یا اس پر اس کی برداشت سے زیادہ بار ڈالے گا، یا اس سے اس کی رضا مندی کے بغیر کوئی چیز لے گا، اس کے خلاف مَیں خود قیامت کے روز مدعی بنوں گا۔''

اُسی اصول کے مطابق نبی ﷺ نے نجران، اَیلہ، اَذرُعات، ہجر اور دوسرے جن جن علاقوں اور قبیلوں کے ساتھ صلح کی ان سب کو اُن کی زمینوں، جائدادوں اور صنعتوں اور تجارتوں پر بدستور بحال رہنے دیا اور صرف وہ جزیہ و خراج ان سے وصول کرنے پر اکتفا فرمایا جس پر ان سے معاہدہ ہوا تھا، پھر اسی پر خلفائے راشدین نے بھی عمل کیا۔ عراق، شام، الجزیرہ، مصر، ارمینیہ، غرض جہاں جہاں بھی کسی شہر اور کسی بستی کے لوگوں نے صلح کے طریقے پر اپنے آپ کو اِسلامی حکومت کے حوالہ کیا ان کی املاک بدستور ان کے قبضے میں رہنے دی گئیں اور ان سے مالِ صلح کے سوا کوئی چیز کبھی وصول نہ کی گئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض اہم مصلحتوں کی بنا پر نجران کے باشندوں کو اندرونِ عرب سے شام و عراق کی طرف منتقل کیا بھی گیا تو ان میں سے جس جس کے پاس نجران میں جتنی زرعی اور سکنی جائداد تھی اس کے بدلے میں نہ صرف اُتنی ہی جائداد اسے دوسری جگہ دی گئی بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنے شام و عراق کے گورنروں کے نام فرمانِ عام لکھا کہ جس کے علاقے میں بھی

وہ جا کر آباد ہوں وہ فلیوسّعھم من خریب الارض ''وہ فراخ دلی کے ساتھ افتادہ زمینوں میں سے انھیں دے۔'' (کتاب الاموال لابی عبید، ص ۱۸۹)

اس قاعدۂ کلیہ میں بھی کسی استثنا کی مثال عہدِ نبوت اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے نظائر سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ یہ بھی فقہائے اِسلام کا متفق علیہ قانون ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللّٰہ علیہ اسے اپنی کتاب الخراج میں ایک قانونی دفعہ کے طور پر اس طرح ثبت فرماتے ہیں:

''غیر مسلموں میں سے جس قوم کے ساتھ اس بات پر امام کی صلح ہو جائے کہ وہ مطیعِ حکم ہو جائیں اور خراج ادا کریں تو وہ اہلِ ذمہ ہیں، ان کی اراضی اراضیٔ خراج ہیں، ان سے بس وہی کچھ لیا جائے گا جس پر ان سے صلح ہوئی ہو، ان کے ساتھ عہد پورا کیا جائے گا اور ان پر کسی چیز کا اضافہ نہ کیا جائے گا۔'' (ص ۳۵)

قسمِ سوُم کے احکام

رہے وہ لوگ جو آخر وقت تک مقابلہ کریں اور بزورِ شمشیر مغلوب ہوں، تو ان کے بارے میں تین مختلف طرزِ عمل ہمیں عہدِ نبوت و خلافتِ راشدہ میں ملتے ہیں:

ایک وہ طرزِ عمل جو نبی ﷺ نے مکہ میں اختیار فرمایا، یعنی فتح کے بعد ﴿لَاتَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ کا اعلانِ عام اور مفتوحین کو جان و مال کی پوری معافی۔ اس صورت میں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اہلِ مکہ اپنی زمینوں اور جائدادوں کے بدستور مالک رہے، اور اِسلام قبول کرنے کے بعد ان کی زمینیں عشری زمینیں قرار دے دی گئی۔

دوسرا وہ طرزِ عمل جو آپؐ نے خیبر میں اختیار فرمایا، یعنی مفتوح علاقے کو مالِ غنیمت قرار دینا۔ اس صورت میں سابق مالکوں کی ملکیت ساقط کر دی گئی، ایک حصہ خدا اور رسول کے حق میں لے لیا گیا، اور باقی زمین کو ان لوگوں پر تقسیم کر دیا گیا جو فتح خیبر کے موقع پر لشکرِ اِسلام میں شامل تھے۔ یہ تقسیم شدہ زمینیں جن جن لوگوں کے حصے میں آئیں وہ ان کے مالک قرار پائے اور ان پر عشر لگا دیا گیا۔ (کتاب الاموال، لابی عبید، ص ۵۱۳)

تیسرا وہ طرزِ عمل جو حضرت عمرؓ نے ابتداءً شام اور عراق میں اختیار فرمایا اور بعد میں تمام مفتوح ممالک کا بندوبست اسی کے مطابق ہوا، وہ یہ تھا کہ آپ نے مفتوح علاقے کو فاتح فوج میں تقسیم کرنے کی بجائے اسے تمام مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا، اس کا انتظام مسلمانوں کی طرف سے نیابتًا اپنے ہاتھ میں لے لیا، اصل باشندوں کو حسبِ سابق ان کی زمینوں پر بحال رہنے دیا، ان کو ذمّی قرار دے کر ان پر جزیہ وخراج عائد کر دیا، اور اس جزیہ وخراج کا مصرف یہ قرار دیا کہ وہ عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر صَرف ہو، کیوں کہ بنیادی نظریہ کے اعتبار سے وہی ان مفتوح علاقوں کے اصل مالک تھے۔

اس آخری صورت میں بظاہر ''اجتماعی ملکیت'' کے تصور کا ایک دھندلا سا شائبہ پایا جاتا ہے، مگر جس طرح یہ پورا معاملہ طے ہوا تھا اس کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس اجتماعی ملکیت کو اشتراکیت کے تصور سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب مصر و شام اور عراق کے وسیع علاقے فتح ہوئے تو حضرت زبیرؓ، حضرت بلالؓ اور ان کے ہم خیال لوگوں نے حضرت عمرؓ سے مطالبہ کیا کہ ان علاقوں کی تمام زمینیں اور جائدادیں خیبر کی طرح فاتح فوج میں تقسیم کر دی جائیں، لیکن حضرت عمرؓ نے اس سے انکار کیا اور حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل جیسے اکابر صحابہؓ نے اس معاملہ میں اُن کی تائید کی۔ اس انکار کے وجوہ کیا تھے؟ اس پر وہ تقریریں روشنی ڈالتی ہیں جو اس موقع پر ہوئیں، حضرت معاذؓ نے کہا:

''اگر آپ اسے تقسیم کریں گے تو خدا کی قسم اس کا نتیجہ وہ ہوگا جو آپ ہرگز پسند نہ کریں گے۔ بڑی بڑی زرخیز زمینوں کے ٹکڑے فوج میں تقسیم ہو جائیں گے۔ پھر یہ لوگ مرکھپ جائیں گے اور کسی کی وارث کوئی عورت ہوگی اور کسی کا وارث کوئی بچہ ہوگا، پھر جو دوسرے لوگ اِسلام کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اٹھیں گے انھیں دینے کے لیے حکومت کے پاس کچھ نہ ہوگا۔ لہٰذا آپ وہ کام کیجیے جس میں آج کے لوگوں کے لیے بھی گنجائش ہو اور بعد والوں کے لیے بھی۔''

حضرت علیؓ نے فرمایا:

''ملک کی کاشت کار آبادی کو اس کے حال پر رہنے دیجیے تا کہ وہ سب مسلمانوں کے لیے معاشی قوت کا ذریعہ ہوں۔''

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مَیں زمین کو تم لوگوں پر تقسیم کر دوں اور بعد کے آنے والوں کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ ہو..... آخر بعد کی نسلوں کے لیے کیا رہے گا؟..... کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ آیندہ آنے والوں کے لیے کچھ نہ رہے؟..... اور مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر مَیں اسے تمھارے درمیان تقسیم کر دوں تو تم پانی پر آپس میں فساد کرنے لگو گے۔''

اس بنیاد پر جو فیصلہ کیا گیا وہ یہ تھا کہ زمین اس کے سابق باشندوں ہی کے پاس رہنے دی جائے، اور انھیں ذمی بنا کر ان پر جزیہ و خراج لگا دیا جائے، اور یہ خراج مسلمانوں کی عام فلاح پر صرف ہو۔ اس فیصلہ کی اطلاع حضرت عمرؓ نے اپنے عراق کے گورنر، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو جن الفاظ میں دی تھی وہ یہ ہیں:

فانظر ما اجلبوا بہٖ علیک فی العسکر من کراع او مال فاقسمه بین من حضر من المسلمین واترک الارضین والانهار لعمالها لیکون ذالک فی اعطیات المسلمین، فانّا لو قسمنا هابین من حضرلم یکن لمن بعدهم شیءٌ۔[1]

''جو کچھ اموال منقولہ سپاہیوں نے دورانِ جنگ میں بطورِ غنیمت حاصل کیے ہیں اور لشکر میں جمع کرا دیے ہیں انھیں تو انھی لوگوں میں تقسیم کر دو جو جنگ میں شریک ہوئے تھے، مگر نہروں اور زمینوں کو انھی لوگوں کے ہاتھوں میں رہنے دو جو ان پر کام کرتے تھے تا کہ وہ مسلمانوں کی تنخواہوں کے لیے محفوظ رہیں، ورنہ اگر ہم انھیں بھی موجودہ لوگوں میں تقسیم کر دیں تو پھر بعد والوں کے لیے کچھ نہ رہے گا۔''

[1] اس پوری بحث کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب الخراج، ص ۲۰۔۲۱ اور کتاب الاموال ص ۶۳۔۵۵

اس نئے بندوبست کا اساسی نظریہ تو یہی تھا کہ اب ان مفتوحہ اراضی کے مالک مسلمان ہیں، اور سابق مالکوں کی اصل حیثیت صرف کاشت کارانہ ہے، اور حکومت مسلمانوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے ان کے ساتھ معاملہ کر رہی ہے[1]، لیکن عملاً ذمّی بنا لینے کے بعد انھیں جو حقوق دیے گئے وہ مالکانہ حقوق سے کچھ بھی مختلف نہ تھے۔ وہ انھی رقبوں پر قابض رہے جن پر پہلے قابض تھے۔ ان پر خراج کے سوا کوئی دوسری چیز حکومت یا مسلمانوں کی طرف سے عائد نہ کی گئی اور ان کو اپنی زمینوں پر بیع اور رہن اور وراثت کے وہ تمام حقوق بدستور حاصل رہے جو پہلے حاصل تھے۔ اس معاملہ کو امام ابو یوسفؒ ایک قانونی ضابطہ کی شکل میں یوں بیان فرماتے ہیں:

''جس سرزمین کو امام بزورِ شمشیر فتح کرے اس کے معاملہ میں وہ اختیار رکھتا ہے کہ اگر چاہے تو فاتح فوج میں اسے تقسیم کر دے۔ اس صورت میں وہ عشری زمین ہو جائے گی، لیکن اگر وہ تقسیم کرنا مناسب نہ سمجھے اور بہتر یہی خیال کرے کہ اسے اس کے پُرانے باشندوں کے ہاتھوں میں رہنے دے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے عراق میں کیا، تو وہ ایسا کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ اس صورت میں وہ زمین خراجی ہوگی اور خراج لگ جانے کے بعد پھر امام کو یہ حق باقی نہ رہے گا کہ اس کے باشندوں سے اسے چھین لے۔ وہ ان کی ملک ہوگی، وہ اسے وراثت میں ایک دوسرے کی طرف منتقل کریں گے، اس کی خرید و فروخت کر سکیں گے، ان پر خراج لگا دیا جائے گا، اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالا جائے گا۔'' (کتاب الخرج، ص ۳۵۔۳۶)

---

[1] اس نظریہ کی توضیح اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ عتبہ بن فرقد حضرت عمرؓ سے ملنے آئے اور انھیں اطلاع دی کہ مَیں نے فرات کے کنارے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کس سے؟ انھوں نے عرض کیا اس کے مالکوں سے۔ آپ نے مہاجرین و انصار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا اس کے مالک تو یہاں بیٹھے ہیں۔ (کتاب الاموال، ص ۷۴) اور حضرت علیؓ کا وہ ارشاد بھی اس نظریہ پر روشنی ڈالتا ہے کہ جب عراق کے پرانے زمین داروں میں سے ایک نے آ کر آپ کے سامنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا تو آپ نے فرمایا کہ اب جزیہ تو تجھ سے ساقط ہو گیا لیکن تیری زمین خراجی ہی رہے گی، کیوں کہ وہ ہماری ہے۔ (کتاب الاموال، ص ۸۰)

قسمِ چہارُم کے احکام

مذکورہ بالا تین قسمیں تو اُن اراضی کی تھیں جو پہلے سے مختلف قسم کے لوگوں کی ملکیت میں تھیں اور اِسلامی نظام قائم ہونے کے بعد یا تو ان کی پچھلی ملکیتوں ہی کی توثیق کر دی گئی، یا بعض حالات میں اگر ردّ و بدل کیا بھی گیا تو صرف ہاتھوں میں کیا گیا نہ کہ بجائے خود نظامِ ملکیت میں۔ اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جن زمینوں کا کوئی مالک نہ تھا، یا نہ رہا تھا، ان کے بارے میں نبی ﷺ اور آپ کے خلفا نے کیا طرزِ عمل اختیار فرمایا:

اس نوعیت کی اراضی دو بڑی اصناف پر مشتمل تھیں:

ایک ''مَوَات'' یعنی اُفتادہ زمینیں، خواہ وہ عادیُّ الارض ہوں (جن کے مالک مر کھپ گئے ہوں) یا جن کا کبھی کوئی مالک رہا ہی نہ ہو، یا جو جھاڑیوں، دلدلوں اور سیلابوں کے نیچے آ گئی ہوں۔

دوسری ''خالصہ'' زمینیں، یعنی جن کو سرکاری املاک قرار دیا گیا تھا۔ ان میں کئی طرح کی اراضی شامل تھیں۔ ایک وہ جنھیں مالکوں نے خود ان سے دست بردار ہو کر حکومت کو اختیار دے دیا تھا کہ انھیں جس طرح چاہے استعمال کرے[1]۔ دوسری وہ جن کے مالکوں کو اِسلامی حکومت نے بے دخل کر کے خالصہ کر لیا تھا۔ مثلاً مضافاتِ مدینہ میں بنی نضیر کی زمینیں۔ تیسری وہ جو مفتوحہ علاقوں میں خالصہ قرار دی گئی تھیں۔ مثلاً وہ اراضی جو عراق میں کسریٰ اور اس کے اہلِ خاندان کے قبضہ میں تھیں، یا جن کے مالک جنگ میں مارے گئے تھے یا بھاگ گئے تھے، اور حضرت عمرؓ نے انھیں خالصہ قرار دے دیا تھا[2]۔

ان دونوں اقسام کا حکم ہم الگ الگ بیان کریں گے۔

حقوقِ ملکیت بر بنائے آبادکاری

''مَوَات'' کے بارے میں نبی ﷺ نے اس قدیم ترین اُصول کی تجدید فرمائی جس سے دُنیا

---

[1] ابنِ عباس کی روایت ہے کہ جب نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو انصار نے وہ تمام زمینیں جن تک ان کی آب پاشی کا پانی نہ پہنچتا تھا، آپ کے حوالہ کر دیں تا کہ آپ ان سے جو چاہیں کام لیں۔ (کتاب الاموال، ص ۲۸۲)

[2] اس طرح کی اراضی کی دس اقسام امام ابو یوسف اور ابو عبید رحمہما اللہ نے اپنی کتابوں میں گنائی ہیں۔

میں ملکیت زمین کا آغاز ہوا ہے۔ جب انسان نے اس کرۂ خاکی کو آباد کرنا شروع کیا تو اصول یہی تھا کہ جو جہاں رہ پڑا ہے وہ جگہ اسی کی ہے، اور جس جگہ کو کسی نے کسی طور پر کارآمد بنالیا ہے اُس کے استعمال کا وہی زیادہ حق دار ہے۔ یہی قاعدہ تمام عطیاتِ فطرت پر انسان کے مالکانہ حقوق کی بنیاد ہے، اور اسی کی توثیق نبی ﷺ نے مختلف مواقع پر اپنے ارشادات میں فرمائی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے:

عن عائشة عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من عمر ارضًا لیست لاحدٍ فھوا حق بھا. قال عروة قضٰی بہٖ عمر فی خلافتہٖ. (بخاری، احمد، نسائی)

''حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی دوسرے کی ملک نہ ہو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ اسی پر حضرت عمر نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمل درآمد کیا۔''

عن جابرٍ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من احیٰی ارضًامیتة فھی لہٗ.

(احمد، ترمذی، نسائی، ابنِ حبان)

''جابر بن عبداللّٰہ کی روایت ہے کہ جس کسی نے مردہ زمین کو زندہ کیا (یعنی بے کار پڑی ہوئی زمین کو کارآمد بنالیا) وہ زمین اسی کی ہے۔''

عن سمرہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من احاط حائطًا علٰی ارض فھی لہٗ. (ابوداؤد)

''سمرہ بن جندب سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس نے کسی افتادہ زمین پر احاطہ کھینچ لیا وہ اُسی کی ہے۔''

عن اسمر بن مضرس عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من سبق الٰی ماء لم یسبقہ الیہ مسلم فھو لہٗ. (ابوداؤد)

''اسمر بن مضرس سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی ایسے کنوئیں کو پائے جس پر پہلے کوئی مسلمان قابض نہ ہو وہ کنواں اسی کا ہے۔''

عن عروة قال اشهد انَّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قضٰى ان الارض ارض اللّٰه والعباد عباد اللّٰه، ومن احيٰى مواتًا فهوا حق بها، جاء نا بهذا عن النبى صلى اللّٰه عليه وسلم الذين جائوا بالصلوات عنه. (ابوداؤد)

''عروہ بن زبیر (تابعی) کہتے ہیں کہ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللّٰہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ زمین خدا کی ہے اور بندے بھی خدا کے ہیں، جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے، وہی زمین کا زیادہ حق دار ہے۔ یہ قانون ہم تک نبی ﷺ سے انھی بزرگوں کے ذریعہ پہنچا ہے جن کے ذریعہ سے پنج وقتہ نماز پہنچی ہے۔ (یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم)''

اس فطری اصول کی تجدید و توثیق کرنے کے ساتھ آں حضرت ﷺ نے اس کے لیے دو ضابطے مقرر فرما دیے۔ ایک یہ کہ جو شخص دوسرے کی مملوکہ زمین کو آباد کرے وہ اس فعل آبادکاری کی بِنا پر ملکیت کا حق دار نہ ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ جو شخص خواہ مخواہ احاطہ کھینچ کر یا نشان لگا کر کسی زمین کو روک رکھے اور اس پر کوئی کام نہ کرے اس کا حق تین سال کے بعد ساقط ہو جائے گا۔ پہلے ضابطہ کو آپ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

عن سعيد بن زيد قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من احيٰى ارضًا ميتةً فهى لهٗ وليس لِعِرْقٍ ظالمٍ حقٌّ. (احمد، ابوداؤد، ترمذی)

''سعید بن زید کہتے ہیں کہ رسول اللّٰہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے کسی مردہ زمین کو زندہ کر لیا وہ اسی کی ہے، اور دوسرے کی زمین میں ناروا طور پر آبادکاری کرنے والے کے لیے کوئی حق نہیں ہے۔''

دوسرے ضابطہ کا ماٰخذ یہ روایات ہیں:

عن طاؤس قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عادىّ الارض لِلّٰهِ وللرسول ثم لكم من بعد فمن احيٰى ارضًا ميتة فهى له وليس لمحتجر حق بعد ثلٰث سنين. (ابویوسف، کتاب الخراج)

''طاؤس (تابعی) کہتے ہیں کہ رسول اللّٰہ ﷺ نے فرمایا غیر مملوکہ زمین جس کا کوئی

ولی ووارث نہ ہو خدا اور رسول کی ہے، پھر اس کے بعد وہ تمھارے لیے ہے۔ پس جو کوئی کسی مردہ زمین کو زندہ کرلے وہ اسی کی ہے اور بے کار روک کر رکھنے والے کے لیے تین سال کے بعد کوئی حق نہیں ہے۔''

عن سالم بن عبداللّٰہ ان عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ قال علی المنبر من احیٰی ارضا میتة فھی لہٗ ولیس لمحتجر حق بعد ثلٰث سنین وذٰلک ان رجالًا کانوا یحتجرون من الارض ما لا یعملون. (ابو یوسف۔ کتاب الخراج)

''سالم بن عبداللّٰہ (حضرت عمرؓ کے پوتے) روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللّٰہ عنہ نے برسرِ منبر فرمایا کہ جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اسی کی ہے مگر خواہ مخواہ روک رکھنے والے کے لیے تین سال کے بعد کوئی حق نہیں ہے۔ یہ اعلان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ بعض لوگ زمینوں کو یوں ہی روک رکھتے تھے اور ان پر کوئی کام نہ کرتے تھے۔''

یہ مسئلہ فقہائے اِسلام کے درمیان متفق علیہ ہے۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف اس امر میں کہ آیا محض آبادکاری کا فعل کر لینے ہی سے کوئی شخص ارضِ موات کا مالک ہو جاتا ہے یا ثبوت ملکیت کے لیے حکومت کی منظوری و اجازت ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اس کے لیے حکومت کی منظور کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمدؒ بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ اس معاملہ میں احادیث بالکل صاف ہیں، لہٰذا آبادکار کا حق ملکیت حکومت کی اجازت اور منظوری پر موقوف نہیں ہے، وہ خدا اور رسول کے دیے ہوئے حق کی بنا پر مالک ہو جائے گا، اس کے بعد حکومت کا کام یہ ہے کہ جب معاملہ اس کے سامنے آئے تو وہ اس حق کو تسلیم کرے اور نزاع کی صورت میں اس کا استقرار کرائے۔ امام مالکؒ بستی سے قریب کی زمینوں اور دور دراز کی افتادہ اراضی میں فرق کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی زمینیں ان کے نزدیک اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ رہیں دوسری قسم کی زمینیں تو ان کے لیے امام کے عطیہ کی شرط نہیں۔ وہ محض احیا سے آدمی کی ملک ہو جاتی ہیں۔

اس معاملہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز، دونوں کا طرزِ عمل یہ تھا کہ اگر کوئی

شخص کسی زمین کو افتادہ سمجھ کر آباد کر لیتا، اور بعد میں کوئی دوسرا شخص آ کر ثابت کرتا کہ زمین اس کی تھی، تو اسے اختیار دیا جاتا تھا کہ یا تو آبادکار کے عمل کا معاوضہ ادا کر کے اپنی زمین لے لے، یا زمین کی قیمت لے کر حقِ ملکیت اس کی طرف منتقل کر دے[1]۔

عطیۂ زمین من جانبِ سرکار

پھر ''موات'' اور ''خالصہ'' دونوں طرح کی زمینوں میں سے بکثرت قطعات نبی ﷺ نے خود بھی لوگوں کو عطا فرمائے، اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ بھی برابر اس طرح کے عطیے دیتے رہے۔ اس کی بہت سی نظیریں حدیث و آثار کے ذخیرے میں موجود ہیں جن میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں۔:

(۱)　عروہ بن زبیرؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اور حضرت عمرؓ بن خطاب کو چند زمینیں عطا کی تھیں، پھر حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں حضرت زبیرؓ نے خاندانِ عمرؓ کے لوگوں سے ان کے حصے کی زمین خرید لی اور اس خریداری کی توثیق کے لیے حضرت عثمانؓ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی شہادت یہ ہے کہ نبی ﷺ نے یہ زمینیں انھیں اور عمرؓ بن خطاب کو عطا کی تھیں، سو میں نے خاندانِ عمرؓ سے ان کا حصہ خرید لیا ہے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے کہا کہ عبدالرحمٰن سچی شہادت دینے والے آدمی ہیں خواہ وہ ان کے حق میں پڑتی ہو یا ان کے خلاف۔ (مسند امام احمد)

(۲)　علقمہ بن وائل اپنے والد (وائلؓ بن حُجر) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے انھیں حضرموت میں ایک زمین عطا کی تھی۔ (ابوداؤد، ترمذی)

(۳)　حضرت ابوبکرؓ کی صاحب زادی حضرت اسما بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے ان کے شوہر حضرت زبیرؓ کو خیبر میں ایک زمین عطا فرمائی تھی جس میں کھجور کے درخت بھی تھے اور دوسرے درخت بھی۔ اس کے علاوہ عروہ بن زبیر کا بیان ہے کہ آپؐ نے انھیں ایک نخلستان بنی نضیر کی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج لابی یوسف، ص ۳۶۔۳۷، و کتاب الاموال لابی عبید، ص ۲۸۵۔۳۸۹۔ شیخ علی متقی نے کنزل العمال میں اس مسئلے پر تمام احادیث و آثار کو یک جا جمع کر دیا ہے۔ جو اصحاب اس کی پوری تفصیلات دیکھنا چاہیں وہ کتاب مذکور کے جزدوم میں احیاء موات کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔

زمینوں میں سے بھی دیا تھا، نیز عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک اور وسیع خطۂ زمین بھی آپؐ نے حضرت زبیرؓ کو دیا تھا اور اس کی صورت یہ تھی کہ آپؐ نے ان سے فرمایا: ''گھوڑا دوڑاؤ، جہاں جا کر تمھارا گھوڑا ٹھہر جائے گا وہاں تک کی زمین تمھیں دے دی جائے گی۔ چنانچہ انھوں نے گھوڑا دوڑایا اور جب ایک جگہ جا کر گھوڑا ٹھہر گیا تو وہاں سے اُنھوں نے اپنا کوڑا آگے پھینک دیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا، اچھا، جہاں ان کا کوڑا گرا ہے وہاں تک کی زمین انھیں دے دی جائے۔

(بخاری، احمد، ابوداؤد، کتاب الخراج لابی یوسف، کتاب الاموال لابی عبید)

(۴)　عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ نبی ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کو زمینیں عطا فرمائیں۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)

(۵)　ابورافع بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ان کے خاندان والوں کو ایک زمین عطا کی تھی مگر وہ اسے آباد نہ کر سکے اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں انھوں نے اسے ۸ ہزار دینار میں فروخت کر دیا۔ (کتاب الخراج)

(۶)　ابنِ سیرین کی روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے انصار میں سے ایک صاحب سلیط کو ایک زمین عطا فرمائی۔ وہ اس کے انتظام کے لیے اکثر باہر جاتے رہتے اور بعد میں آ کر انھیں معلوم ہوتا کہ ان کے پیچھے اتنا اتنا قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے یہ یہ احکام دیے۔ اس سے ان کی بڑی دل شکنی ہوتی۔ آخر کار انھوں نے ایک روز آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یہ زمین میرے اور آپ کے درمیان حائل ہوگئی ہے، آپ اسے مجھ سے واپس لے لیں، چنانچہ وہ واپس لے لی گئی۔ بعد میں حضرت زبیرؓ نے اس کے لیے درخواست کی اور آپ نے وہ زمین انھیں دے دی۔ (کتاب الاموال)

(۷)　بلالؓ بن حارث مزنی کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اُن کو عقیق کی پوری زمین عطا فرمائی تھی۔ (کتاب الاموال)

(۸)　عدیؓ بن حاتم کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرات بن حیان عجلی کو یمامہ میں ایک زمین عطا کی تھی۔ (کتاب الاموال)

(۹)　عرب کے مشہور طبیب حارث بن کلدہ کے بیٹے نافع نے حضرت عمرؓ سے درخواست

کی کہ بصرہ کے علاقے میں ایک زمین ہے جو نہ تو اراضیٔ خراج میں شامل ہے اور نہ مسلمانوں میں سے کسی کا مفاد اس سے وابستہ ہے۔ آپ وہ مجھے عطا کر دیں، میں اپنے گھوڑوں کے لیے اس میں چارا کی کاشت کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنر ابوموسیٰ اشعری کو فرمان لکھا کہ اگر اس زمین کی کیفیت وہی ہے جو نافع نے مجھ سے بیان کی ہے تو وہ انھیں دے دی جائے۔ (کتاب الاموال)

(۱۰)　موسیٰ بن طلحہؒ کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں زبیرؓ بن عوام، سعدؓ بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعودؓ، اُسامہؓ بن زید، خبابؓ بن اَرت، عمار بن یاسر اور سعد بن مالک رضی اللہ عنہم کو زمینیں عطا کی تھیں۔ (کتاب الخراج کتاب الاموال)

(۱۱)　عبداللہ بن حسنؒ کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ کی درخواست پر حضرت عمرؓ نے انھیں ینبُع کا علاقہ عطا کیا تھا۔ (کنزل العمال)

(۱۲)　امام ابو یوسف متعدد معتبر حوالوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ان سب زمینوں کو خالصہ قرار دیا تھا جو کسریٰ اور آلِ کسریٰ نے چھوڑی تھیں، یا جن کے مالک بھاگ گئے تھے، یا جنگ میں مارے گئے تھے، یا جو دلدل، سیلاب اور جھاڑیوں کے نیچے آ گئی تھیں۔ پھر جن لوگوں کو بھی آپ زمینیں عطا کرتے تھے انھی اراضی میں سے کرتے تھے۔ (کتاب الخراج)

عطیۂ زمین کے بارے میں شرعی ضابطہ

یہ عطائے زمین کا طریقہ محض شاہانہ بخشش و انعام کی نوعیت نہ رکھتا تھا بلکہ اس کے چند قواعد تھے جو ہمیں احادیث و آثار میں ملتے ہیں۔

(۱)　پہلا قاعدہ یہ تھا کہ جو شخص زمین لے کر اس پر کچھ کام نہ کرے اس کا عطیہ منسوخ سمجھا جائے گا۔ اس کی نظیر میں امام ابو یوسف یہ روایت لاتے ہیں کہ نبی ﷺ نے قبیلۂ مُزَینہ اور جُہینہ کے لوگوں کو کچھ زمین دی تھی۔ مگر انھوں نے وہ بے کار رکھ چھوڑی۔ پھر کچھ اور لوگ آئے اور انھوں نے اسے آباد کر لیا۔ اس پر مزینہ اور جہینہ کے لوگ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں دعویٰ لے کر آئے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا اگر یہ میرا یا ابوبکرؓ کا عطیہ ہوتا تو مَیں اسے منسوخ کر دیتا، لیکن یہ عطیہ تو نبی ﷺ کا ہے، اس لیے میں مجبور ہوں۔ البتہ قانون یہی ہے کہ

من کانت له ارض ثم ترکها ثلث سنین فلم یعمرها نعمرها قومٌ اٰخرون فهم احق بها.

''جس کے پاس ایک زمین ہو اور وہ اسے تین برس تک بے کار ڈال رکھے اور آباد نہ کرے، پھر کچھ دوسرے لوگ آ کر اسے آباد کر لیں تو وہی اس زمین کے زیادہ حق دار ہیں۔''

(۲)　دوسرا قاعدہ یہ تھا کہ جو عطیہ صحیح طور پر استعمال میں نہ آ رہا ہو اس پر نظرِ ثانی کی جا سکتی ہے۔ اس کی نظیر میں ابو عبید نے کتاب الاموال میں اور یحییٰ بن آدم نے الخراج میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے بلال بن حارثؓ مُزَنی کو پوری وادیٔ عقیق دے دی تھی۔ مگر وہ اس کے بڑے حصے کو آباد نہ کر سکے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ زمین تمھیں اس لیے نہیں دی تھی کہ تم نہ خود اسے استعمال کرو اور نہ دوسروں کو استعمال کرنے دو۔ اب تم اس میں سے بس اتنی رکھ لو جسے استعمال کر سکو۔ باقی ہمیں واپس کرو تا کہ ہم اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ بلال بن حارثؓ نے اس سے انکار کیا، حضرت عمرؓ نے پھر اصرار کیا۔ آخر کار جتنا رقبہ ان کے زیرِ استعمال تھا اسے چھوڑ کر باقی پوری زمین آپ نے ان سے واپس لے لی اور دوسرے مسلمانوں میں اس کے قطعات بانٹ دیے۔

(۳)　تیسرا قاعدہ یہ تھا کہ حکومت صرف اراضی موات اور اراضی خالصہ ہی میں سے زمینیں عطا کرنے کی مجاز ہے۔ یہ حق اسے نہیں ہے کہ ایک شخص کی زمین چھین کر دوسرے کو دے دے۔ یا اصل مالکان اراضی کے سر پر خواہ مخواہ ایک شخص کو جاگیردار یا زمین دار بنا کر مسلط کر دے اور اسے مالکانہ حقوق عطا کر کے اصل مالکوں کی حیثیت اس کے ماتحت کاشت کاروں کی سی بنا دے۔

(۴)　چوتھا قاعدہ یہ تھا کہ حکومت زمینیں انھی لوگوں کو دے گی جنھوں نے فی الحقیقت اجتماعی مفاد کے لیے کوئی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہو، یا جن سے اب اس نوعیت کی کوئی خدمت متعلق ہو، یا جنھیں عطیہ دینا کسی نہ کسی طور پر اجتماعی مفاد کے لیے مناسب ہو۔ رہیں شاہانہ غلط بخشیاں جن سے ڈوم ڈھاڑیوں اور خوشامدی لوگوں کو نوازا گیا ہو، یا وہ عطیے جو ظالموں اور جباروں نے اجتماعی مفاد کے برعکس خدمات انجام دینے والوں کو دیے ہوں، تو وہ کسی طرح جائز عطایا کی تعریف میں نہیں آتے۔

جاگیروں کے معاملہ میں صحیح شرعی رویہ

موخر الذکر دونوں اصولوں کی بنیاد اس پورے طرزِ عمل پر قائم ہے جو نبی ﷺ اور آپ کے خلفا نے برتا تھا۔ اس کی تشریح امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب الخراج میں اس طرح فرماتے ہیں:

''امامِ عادل کو حق ہے کہ جو مال کسی کی ملک نہ ہو اور جس کا کوئی وارث بھی نہ ہو اس میں سے ان لوگوں کو عطیے اور انعام دے جن کی اِسلام میں خدمات ہوں..... جس شخص کو وُلاۃِ مہدیین (راہِ راست پر چلنے والے فرماں رواؤں) نے کوئی زمین عطا کی ہو اسے واپس لینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ لیکن جو زمین کسی حاکم نے ایک سے چھینی اور دوسرے کو بخشی تو اس کی حیثیت اس مال کی سی ہے جو ایک سے غصب کیا گیا اور دوسرے کو عطا کر دیا گیا۔''

کچھ دُور آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:

''پس جن جن اقسام کی زمینوں کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ امام انھیں عطا کر سکتا ہے۔ ان میں سے جو زمین بھی عراق، عرب، الجبال اور دوسرے علاقوں میں ''وُلاۃِ مہدیّین'' نے کسی کو دی ہے، بعد کے خلفا کے لیے حلال نہیں ہے کہ اسے واپس لیں یا ان لوگوں کے قبضے سے نکالیں جن کے پاس ایسی زمینیں اس وقت موجود ہیں، خواہ وہ اُنھوں نے وراثت میں پائی ہوں یا وارثوں سے خریدی ہوں۔''

آخر میں اس بحث کو ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پس یہ نظیریں ثابت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی زمینیں عطا کی ہیں اور آپ کے بعد خلفا بھی دیتے رہے ہیں۔ آں حضرت ﷺ نے جسے بھی زمین دی یہ دیکھ کر دی کہ ایسا کرنے میں صلاح اور بہتری ہے، مثلاً کسی نَومسلم کی تالیفِ قلب، یا زمین کی آبادی۔ اسی طرح خلفائے راشدینؓ نے بھی جسے زمین دی یہ دیکھ کر دی کہ اس نے اِسلام میں کوئی عمدہ خدمت انجام دی ہے، یا وہ اعدائے اِسلام کے مقابلہ میں کارآمد ہو سکتا ہے، یا یہ کہ ایسا کرنے میں بہتری ہے۔'' (کتاب الخراج، ص ۳۲۔۳۵)

یہ تصریحات امام ابو یوسفؒ نے دراصل عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے اس سوال کے جواب میں فرمائی ہیں کہ جاگیروں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور ایک فرماں روا کہاں تک جاگیریں عطا اور ضبط کرنے کا مجاز ہے؟ اس کا جو کچھ جواب امام صاحب نے دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے عطائے زمین بجائے خود تو ایک جائز فعل ہے، مگر نہ سب زمین دینے والے یکساں ہیں اور نہ سب لینے والے۔ ایک عطیہ وہ ہے جو عادل، متدیّن، راست رو اور خدا ترس حکم رانوں نے دیا ہو۔ اعتدال کے ساتھ دیا ہو۔ دین اور ملت کے سچے خادموں کو، یا کم از کم مفید اور کارآمد لوگوں کو دیا ہو۔ کسی ایسی غرض کے لیے دیا ہو جس کا فائدہ بحیثیتِ مجموعی ملک اور ملت ہی کی طرف پلٹتا ہو اور ایسے مال میں سے دیا ہو جس کے دینے کے وہ مجاز تھے۔ دوسرا عطیہ وہ ہے جو ظالموں، جباروں اور نفس پرستوں نے دیا ہو۔ بُرے لوگوں کو دیا ہو۔ بُری اغراض کے لیے دیا ہو۔ بے تحاشا دیا ہو اور ایسے مال میں سے دیا ہو جس کے دینے کا اُنھیں حق نہ تھا۔ یہ دو مختلف طرح کے عطیے ہیں اور دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے۔ پہلا عطیہ جائز ہے اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اسے برقرار رکھا جائے۔ دوسرا عطیہ ناجائز ہے اور انصاف چاہتا ہے کہ اسے منسوخ کیا جائے۔ بڑا ظالم ہے وہ جو دونوں طرح کے عطیوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دے۔

حقوقِ ملکیت کا احترام

یہ شواہد و نظائر اُس پورے دَور کے عمل دَرآمد کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس میں قرآن کے منشا کی تفسیر خود قرآن کے لانے والے نے اور اس کے براہِ راست شاگردوں نے اپنے اقوال اور اعمال میں کی تھی۔ اس نقشے کو دیکھنے کے بعد کسی شخص کے لیے اس طرح کا کوئی شُبہ تک کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ زمین کے معاملہ میں اِسلام کے پیشِ نظر یہ اصول تھا کہ اسے شخصی ملکیتوں سے نکال کر اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے۔ اس کے بالکل برعکس اس نقشے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اِسلام کی نگاہ میں زمین سے انتفاع کی فطری اور صحیح صورت صرف یہی ہے کہ وہ افراد کی ملکیت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے محض اتنا ہی نہیں کیا کہ اکثر و بیش تر حالات

میں سابق ملکیتوں ہی کو برقرار رکھا، بلکہ جن صورتوں میں آپ نے پچھلی ملکیتیں منسوخ کیں اُن میں بھی نئی انفرادی ملکیتیں پیدا کر دیں، اور آیندہ کے لیے غیر مملوکہ اراضی پر نئی ملکیتوں کے قیام کا دروازہ کھول دیا، اور خود سرکاری املاک کو بھی افراد میں تقسیم کر کے انھیں حقوقِ ملکیت عطا فرمائے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ سابق نظامِ ملکیت کو محض ایک ناگزیر بُرائی کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک اصولِ برحق کی حیثیت سے اسے باقی رکھا گیا اور آیندہ کے لیے اسی کو جاری کیا گیا۔

اس کا مزید ثبوت وہ احکام ہیں جو نبی ﷺ نے حقوقِ ملکیت کے احترام کے متعلق دیے ہیں۔ مسلم نے متعدد حوالوں سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے بہنوئی سعید بن زید رضی اللّٰہ عنہ پر ایک عورت نے مروان بن حکم کے زمانہ میں دعوٰی دائر کیا کہ انھوں نے میری زمین کا ایک حصہ ہضم کر لیا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت سعیدؓ نے مروان کی عدالت میں جو بیان دیا وہ یہ تھا کہ مَیں اس کی زمین کیسے چھین سکتا تھا جب کہ مَیں نے رسول اللّٰہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ

مَن اخذ شبرًا من الارض ظلمًا طُوِّقه الی سبع ارضین.

''جس شخص نے بالشت بھر زمین بھی از راہِ ظلم لی اس کی گردن میں سات تہوں تک اُسی زمین کو طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔''

اسی مضمون کی احادیث مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی نقل کی ہیں۔

(مسلم، کتاب المساقات والمزارعہ۔ باب تحریم الظلم وغصب الارض)

ابوداؤد، نسائی اور ترمذی نے متعدد حوالوں سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

لیس لعِرقٍ ظالمٍ حقٌّ.

''دوسرے کی زمین میں بلا استحقاق آبادکاری کرنے والے کے لیے کوئی حق نہیں ہے۔''

رافعؓ بن خدیج کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

من زرع فی ارض قوم بغیر اذنهم فلیس لهٗ من الزرع شیءٌ ولهٗ نفقتهٗ.

''جس نے دوسرے لوگوں کی زمین میں ان کی اجازت کے بغیر کاشت کی وہ اس کھیتی پر تو کوئی حق نہیں رکھتا، البتہ اس کا خرچ اسے دلوا دیا جائے گا۔'' (ابوداؤد، ابنِ ماجہ، ترمذی)

عروہ بن زبیرؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں ایک شخص نے ایک انصاری کی زمین میں کھجور کے درخت لگا دیے تھے۔ اس پر آں حضرت ﷺ نے فیصلہ دیا کہ وہ درخت اکھاڑ کر پھینک دیے جائیں اور زمین اصل مالک کے حوالہ کی جائے۔ (ابوداؤد)

یہ احکام کس چیز کی شہادت دیتے ہیں؟ کیا اس بات کی کہ زمین کی شخصی ملکیت کوئی برائی تھی جسے مٹانا مطلوب تھا مگر ناگزیر سمجھ کر مجبوراً برداشت کیا گیا؟ یا اس بات کی کہ یہ سراسر ایک جائز و معقول حق تھا جس کا احترام افراد اور حکومت دونوں پر فرض کر دیا گیا؟

.....☆☆☆.....

۳

مزارعت کا مسئلہ

اب ہمیں اُن احادیث کی تحقیق کرنی چاہیے جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شریعت زمین کی شخصی ملکیت کو صرف خود کاشتی کی حد تک محدود کر دینا چاہتی ہے اور اسی غرض کے لیے اس نے بٹائی اور نقد لگان کی ممانعت کی ہے۔ اس مسئلے کی پوری تحقیق کے لیے پہلے ہم ان احادیث کو بتمام و کمال نقل کریں گے جن پر اس گمان کی بِنا قائم ہے، پھر ان پر تنقید کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس معاملہ میں اصل احکامِ شریعت کیا ہیں۔

احادیث کا تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن روایات میں مزارعت یا کرایہ زمین کی ممانعت وارد ہوئی ہے، یا جن میں یہ حکم آیا ہے کہ آدمی کے پاس خود کاشت سے زائد جتنی زمین ہو اسے دوسروں کو مفت دے دے یا روک رکھے، وہ ۶ (چھے) صحابیوں سے مروی ہیں:

رافعؓ بن خدیج، جابرؓ بن عبداللہ، ابوہریرہؓ، ابوسعیدؓ خدری، زیدؓ بن ثابت اور ثابتؓ بن ضحاک۔ سہولتِ بیان کی خاطر ہم ان میں سے ہر ایک کی روایات کو الگ الگ نقل کرتے ہیں۔

رافعؓ بن خدیج کی روایات

اس مسئلے نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جس صحابی کے ذریعہ سے شہرت پائی ہے وہ حضرت رافعؓ بن خدیج ہی ہیں، اس لیے پہلے انھی کی روایات کو لیجیے۔

۱۔ رافعؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں زراعت کے لیے زمینیں لیتے تھے اور تہائی، چوتھائی اور ایک خاص مقدار غلہ کرایہ کے طور پر مقرر کرتے تھے۔ ایک دن میرے چچاؤں میں سے ایک آئے اور انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک ایسے کام سے روک دیا ہے

جو ہمارے لیے نافع تھا، مگر ہمارے لیے اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری زیادہ نافع ہے۔

نهانا ان نحاقل بالارض فتكريها على الثلث والربع والطعام المسمّٰى وامر رب الارض ان يزرعها اويُزرعها وكره كرائها وما سوٰى ذالك.

''آپؐ نے ہمیں اس بات سے منع کر دیا کہ ہم زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کریں اور تہائی اور چوتھائی اور مقرر مقدر غلہ کے عوض انھیں کرایہ پر دیں اور آپ نے حکم دیا ہے کہ مالک زمین یا تو خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کرنے کے لیے دے دے اور آپ نے زمین کے کرایہ کو اور اس کے سوا دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا ہے۔'' (مسلم)

۲۔ ایک اور روایت میں حضرت رافعؓ اپنے چچا کا نام ظہیر بن رافع بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان سے نبی ﷺ نے پوچھا تم لوگ اپنی کھیتی باڑی کا معاملہ کس طرح کرتے ہو؟ انھوں نے مزارعت کی تفصیل بتائی۔ اس پر آپ نے فرمایا:

فلا تفعلوا، از رعوها او ازرعوها او امسكوها.

''ایسا نہ کیا کرو، یا خود زراعت کرو، یا دوسروں کو زراعت کے لیے دے دو، یا اپنی زمینوں کو روک رکھو۔'' (مسلم، بخاری، ابنِ ماجہ)

۳۔ ایک اور روایت میں حضرت رافعؓ خود اپنا قصہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی کھیتی کو پانی دے رہے تھے۔ وہاں سے رسول اللہ ﷺ کا گزر ہوا۔ آپؐ نے پوچھا یہ کس کی کھیتی ہے اور کس کی زمین ہے؟ انھوں نے عرض کیا:

زرعي ببذري وعملي، لي الشطر ولبني فلان الشطر.

''میری کھیتی ہے۔ اس میں تخم اور عمل میرا ہے۔ آدھی پیداوار میری ہوگی اور آدھی بنی فلاں کی۔''

اس پر نبی ﷺ نے فرمایا:

اربيتما، فرد الارض عَلٰى اهلها وخذ نفقتك. (ابوداؤد)

''تم نے سودی معاملہ کیا۔ زمین اس کے مالکوں کو واپس کر دو اور اپنا خرچ ان سے وصول کر لو۔[1]''

---

[1] اس حدیث کے سلسلۂ سند میں ایک راوی بکر بن عامر البجلی ہے جس کے معتبر ہونے میں کلام کیا گیا ہے۔
(ملاحظہ ہو نیل الاوطار۔ جلد ۵، ص ۲۳۴)

۴۔　مجاہد کی روایت ہے کہ رافع بن خدیج نے کہا:

نهانا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن امرٍ کان لنا نافعًا اذا کانت لاحدنا ارض ان یعطیها ببعض خراجها وبدراهم وقال اذا کانت لاحدکم ارض فلیمنحها اخاه اولیزرعها.

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک ایسے کام سے روک دیا جو ہمارے لیے نافع تھا، یعنی اس بات سے کہ اگر ہم میں سے کسی کے پاس کوئی زمین ہو تو وہ اسے اس کی پیداوار اور نقدی عوض زراعت کے لیے کسی دوسرے شخص کو دے، اور آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کے پاس کوئی زمین ہو تو یا وہ اپنے کسی بھائی کو یوں ہی دے دے یا خود کاشت کرے۔'' (ترمذی)

۵۔　سعید بن مسیّب نے رافعؓ بن خدیج سے یہ روایت نقل کی ہے:

نهٰی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن المحاقلة والمزابنة وقال انما یزرع ثلٰثة، رجل لهٗ ارض فیزرعها، ورجل منح ارضا فهویزرع مامنح، ورجل استکریٰ ارضًا بذهب او فضة.

''رسول اللہ ﷺ نے محاقلہ (بٹائی پر کاشت کرانے) اور مزابنہ (درختوں پر کھجور کی بیع) سے منع فرمایا اور فرمایا کہ زراعت تین ہی آدمی کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جس کی اپنی زمین ہو اور وہ اس میں خود کاشت کرے۔ دوسرا وہ جسے کوئی زمین یوں ہی دے دی جائے اور وہ اس میں کھیتی باڑی کرے۔ تیسرا وہ جو سونے اور چاندی کے عوض زمین کرائے پر لے۔'' (ابوداؤد، ابنِ ماجہ، نسائی)

مگر نسائی نے ایک دوسری روایت کے ذریعہ سے یہ بتایا ہے کہ دراصل اس حدیث کا صرف پہلا ٹکڑا، یعنی **نهٰی عن المحاقلة والمزابنه** ہی نبی ﷺ کا فرمایا ہوا ہے۔ باقی کلام سعید بن مسیّب کا اپنا تشریحی کلام ہے جو بعد میں اصل حدیث کے ساتھ خلط ملط ہو گیا۔

۶۔　سلیمان بن یسار نے رافع بن خدیج سے جو روایت نقل کی ہے اس میں وہ اپنے کسی چچا کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے آ کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

من کانت له ارض فلا یکریها بطعام مسمّٰی.

''جس کے پاس کوئی زمین ہو وہ غلے کی ایک مقدار ٹھہرا کر اسے کرائے پر نہ دے۔''

اور دوسری روایت کی رُو سے اُن کے چچا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

من کانت لهٗ ارض فلیزرعها اورلیزرعها اخاه ولایکاریها بثُلث ولا بربع ولا بطعام مسمّٰی. (ابنِ ماجہ، ابوداؤد، نسائی)

''جس کے پاس کوئی زمین ہو اسے چاہیے کہ یا خود زراعت کرے یا اپنے کسی بھائی کو زراعت کے لیے دے دے، مگر کرائے پہ نہ دے، نہ تہائی پیداوار پر، نہ چوتھائی پر، اور نہ ایک مقرر مقدار غلہ پر۔''

۷۔ رافعؓ بن خدیج کے صاحب زادے اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ابورافع نے رسول اللہ ﷺ کے پاس سے آ کر ہم لوگوں کو بتایا کہ

نهانا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن امر کان یرفق بنا، وطاعة اللّٰه وطاعة رسوله ارفق، نهانا ان یزرع احدنا الا ارضًا یملک رقبتها اومنیحة یمنحها رجل.

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک ایسے کام سے روک دیا ہے جو ہمارے لیے فائدہ مند تھا، مگر اللہ کی اطاعت اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ہمارے لیے زیادہ فائدہ مند ہے۔ آپ نے ہمیں اس بات سے منع فرما دیا کہ کوئی شخص کسی زمین میں زراعت کرے الا یہ کہ یا تو وہ خود اس زمین کا مالک ہو، یا کوئی دوسرا شخص اسے بلا معاوضہ زراعت کے لیے دے دے۔'' (ابوداؤد)

۸۔ ابنِ عمرؓ کی روایت ہے کہ ہم اپنی زمین کرائے پر دیا کرتے تھے، پھر جب ہم نے رافعؓ بن خدیج کی حدیث سُنی تو یہ کام چھوڑ دیا۔ دوسری روایت میں ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم مخابرہ (یعنی بٹائی پر کاشت کا معاملہ) کرتے تھے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ پھر رافع نے دعویٰ کیا کہ اللہ کے نبیؐ نے اس سے منع کیا تھا۔ لہٰذا ان کے قول کی وجہ سے ہم نے اسے چھوڑ دیا۔ (مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ)

جابر بن عبداللہ کی روایات

رافعؓ بن خدیج کے بعد اس مضمون کے احکام کا دوسرا بڑا ماخذ جابرؓ بن عبداللہ کی روایات ہیں۔ان میں حسبِ ذیل احادیث وارد ہوئی ہیں:

۱. **نھٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن کراء الارض.**

''رسول اللہ ﷺ نے زمین کے کرائے سے منع فرمادیا۔'' (مسلم)

۲. **نھٰی عن المخابرۃ.**

''آں حضرت ﷺ نے مخابرہ (بٹائی پر کاشت کرانے) سے منع فرمادیا۔'' (مسلم)

۳. **نھٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان توخذ الارض اجرًا وحطًا.**

''رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ زمین اجرت پر یا پیداوار کے حصے پر کاشت کے لیے لی جائے۔'' (مسلم)

۴. **من کانت لہ ارض فلیزرعھا فان لم یزرعھا فلیزر عھا اخاہ.**

''جس کے پاس کوئی زمین ہو اُسے چاہیے کہ خود کاشت کرے، اور اگر خود نہ کرتا ہو تو اپنے کسی بھائی کو کاشت کے لیے دے دے۔''

یہ حدیث مختلف روایتوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

من کانت لہ فضل ارض لیزرعھا اولیمنحھا اخاہ فان ابٰی فلیمسک ارضہٗ.

''جس کے پاس فاضل زمین ہو اسے چاہیے کہ یا خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو دے دے، لیکن اگر وہ نہ دینا چاہے تو پھر اپنی زمین کو روک رکھے۔''

دوسری روایت میں ہے:

فلیھبھا اولیعرھا.

''اسے چاہیے کہ ہبہ کردے یا عاریتًا دے دے۔''

ایک اور روایت میں ہے

ولا یواجرھا ایاہ.

''اسے اُجرت پر نہ دے۔''

ایک اور روایت میں ہے:

ولا یکریھا.

''اسے کرایہ پر نہ دے۔'' (مسلم، بخاری، ابنِ ماجہ)

۵. نھٰی عن بیع ارض البیضاء سنتین او ثلاثًا.

''آں حضرت ﷺ نے خالی زمین کو دو تین سال کے لیے بیچنے سے منع فرمایا۔''

دوسری روایت میں ہے:

عن بیع السنین.

''چند سال کے لیے بیع کرنے سے۔''

ایک اور روایت میں ہے:

عن بیع ثمر سنین.

''چند سال کے ثمرہ کی بیع سے۔'' (مسلم)

۶. سمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ینھٰی عن المزابنۃ والحقول.

''جابرؓ نے رسول اللہ ﷺ کو مزابنہ اور حقوں سے منع کرتے ہوئے سنا۔''

پھر حضرت جابرؓ نے خود ہی ''مزابنہ'' کی تشریح یہ کہ اس سے مراد ''کھجوروں کے بدلے ثمرہ بیچنا ہے۔'' اور ''حقول'' کی تشریح میں کہا کہ اس سے مراد ''زمین کو کرایہ پر دینا ہے۔'' (مسلم)

۷. سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول من لم یذر المخابرۃ فلیؤذن بحرب من اللّٰہ ورسولہٖ.

''مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص مخابرہ نہ چھوڑے اسے اللہ اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔'' (ابوداؤد)

مزید تائیدی روایات

باقی چار صحابیوں کی روایات جو مذکورہ بالا احادیث کی مزید تصدیق و تائید کرتی ہیں، حسبِ ذیل ہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من کانت لہٗ ارض فلیزرعھا اولیمنحھا اخاہ فان ابٰی فلیمسک ارضہ. (بخاری، مسلم، ابنِ ماجہ)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود کاشت کرے، یا اپنے بھائی کو بلا معاوضہ دے دے، لیکن اگر وہ نہ دینا چاہیے تو اپنی زمین کو روک رکھے۔''

نھٰی عن المحاقلۃ والمزابنۃ. (مسلم۔ترمذی)

''آں حضرت ﷺ نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا۔''

حضرت ابو سعیدؓ خدری سے:

نھٰی عن المزابنۃ والمحاقلۃ. والمزابنۃ اشتراء الثمر فی روس النخل. والمحاقلۃ کراء الارض. (مسلم، ابنِ ماجہ)

''حضور ﷺ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع فرمایا۔ مزابنہ سے مراد درختوں پر کھجور کے ثمرہ کی خریداری ہے۔ اور محاقلہ سے مراد زمین کا کرایہ ہے۔''

ثابتؓ بن ضحاک سے:

نھٰی عن المزارعۃ. (مسلم)

''حضور ﷺ نے مزارعت سے منع فرما دیا۔''

زیدؓ بن ثابت سے:

نھٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن المخابرۃ. قلت وما المخابرۃ؟ قال ان تاخذ الارض بنصف اوثلث اوربع. (ابوداؤد)

''رسول اللہ ﷺ نے مخابرہ سے منع فرمایا۔ ثابت بن حجاج نے حضرت زیدؓ بن ثابت سے پوچھا کہ مخابرہ کے کیا معنی ہیں؟ حضرت زیدؓ نے جواب دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم آدھی یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض زمین لو۔''

تنقید بلحاظ نقل وروایت

اُوپر ہم نے وہ تمام روایات لفظ بلفظ نقل کر دی ہیں جن پر اس مسئلے کا مدار ہے کہ اسلام میں بٹائی اور نقد لگان کی ممانعت کی گئی ہے اور خود کاشت کرنے یا مفت زمین عطا کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ غالبًا اس سلسلہ کی کوئی قابلِ ذکر اور لائقِ اعتناء روایت ہم سے چھوٹ نہیں گئی ہے۔ آیئے اب ہم ذرا ان پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ آیا فی الحقیقت اس معاملہ میں اِسلام کا مسلک وہی ہے جو ان کثیر التعداد روایات سے ظاہر ہوتا ہے؟

ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ محض ایک مفتی اور معلم ہی نہ تھے بلکہ ملک کے حاکم بھی تھے اور عملاً پورا نظم ونسق آپ کے ہاتھ میں تھا۔

ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ زمین کا معاملہ دو چار یا دس پانچ افراد کی نجی اور شخصی زندگی کا کوئی اِتفاقی وہنگامی معاملہ نہیں ہے کہ اس کا حکم بس چند آدمیوں کے کان میں چپکے سے کہہ دیا جاتا۔ یہ تو ایک پوری سلطنت کے نظم ونسق سے تعلق رکھنے والی چیز ہے جس سے لاکھوں آدمیوں کی معیشت مستقل طور پر متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں جو پالیسی بھی آں حضرت ﷺ نے اختیار کی تھی وہ آپ کے زمانہ میں اور آپ کے خلفا کے زمانے میں ایک نہایت مشہور ومعروف بات ہونی چاہیے تھی۔

پھر کوئی ایسا شخص جو نبی ﷺ کی سیرت وشخصیت اور آپ کے خلفائے راشدین کی زندگی اور آپ کے صحابۂ کرام کے حالات سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ نبی ﷺ معاذ اللہ ان لوگوں میں سے تھے جو زبان سے ایک چیز کو غلط کہیں اور اسے رائج رہنے دیں اور زبان سے ایک دوسرے طریقہ کو برحق کہیں اور عملاً اسے جاری نہ کریں۔ یا یہ کہ حضور ایک طریقہ کو

روکنا اور دوسرے طریقے کو رائج کرنا چاہتے ہوں اور صحابۂ کرام مان کر نہ دیں۔ یا یہ کہ خلفائے راشدین کو یہ معلوم ہو چکا ہو کہ حضور ﷺ کسی رواج کا انسداد کر کے ایک دوسرا اصلاحی طریقہ جاری کرنا چاہتے تھے اور پھر وہ اپنے تمام زمانۂ خلافت میں آپ کے منشا کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہ جائیں۔

یہ تین حقیقتیں ایسی ظاہر و باہر ہیں جن سے کسی صاحبِ عقل و فکر اور صاحب علم و نظر آدمی کے لیے مجالِ انکار نہیں ہے۔ اب اگر آپ یہ سنیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کے وسط تک، یعنی تقریباً ۵۰ سال تک مذکورہ بالا پانچ چھے اصحاب کے سوا کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ آں حضرت ﷺ نے بٹائی اور لگان پر زمین کاشت کے لیے دینے کو منع فرمایا ہے، اور یہ کہ نبی ﷺ خود اور تمام اکابر صحابہؓ اور آپؐ سے قریب ترین تعلق رکھنے والے تمام بڑے بڑے گھرانے بٹائی پر زمینیں دیتے رہے، اور یہ کہ خلافتِ راشدہ کے پورے عہد میں یہی طریقہ رائج رہا، تو کیا آپ حیرت سے ہک دَک نہ رہ جائیں گے؟ حقیقت میں یہ ہے نہایت حیرت انگیز بات، مگر واقعہ یہی ہے۔ ہم ان روایات کو یہاں نمبروار نقل کرتے ہیں جن سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

(۱)　نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی زمینیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں برابر کرائے پر دیتے رہے۔ امیر معاویہؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں بھی ان کا یہی طریقہ رہا۔ یہاں تک کہ جب امیر معاویہؓ کی خلافت کا آخری زمانہ آیا (یعنی تقریباً ۵۰ھ یا اس کے بعد کا زمانہ) تو انھیں یہ خبر پہنچی کہ رافعؓ بن خدیج نبی ﷺ سے اس فعل کی ممانعت کا حکم روایت کرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ رافعؓ بن خدیج سے ملنے گئے اور مَیں اُن کے ساتھ تھا۔ انھوں نے رافع سے پوچھا کہ یہ کیا روایت ہے؟ جو تم بیان کرتے ہو۔ رافع نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ زمینوں کے کرائے سے منع فرماتے تھے۔ اس پر ابنِ عمرؓ نے زمینیں کرائے پر دینا بند کر دیں، اور جب کبھی ان سے اس کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ جواب دیتے کہ رافع بن خدیجؓ کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا تھا۔

اسی سے ملتی جلتی روایت خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحب زادے حضرت سالمؒ روایت کرتے ہیں۔ان کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عبداللہؓ کے سوال پر حضرت رافعؓ نے انھیں جواب دیا کہ مَیں نے اپنے دو چچاؤں کو، جو بدری صحابی تھے، گھر والوں سے یہ کہتے سنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین کے کرائے سے منع کیا ہے۔اس پر حضرت عبداللہ نے فرمایا:

لقد كنت اعلم فى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الارض تكرٰى.

''مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں زمینیں کرائے پر دی جاتی تھیں۔''

مگر حضرت عبداللہؓ نے اس ڈر سے کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہو اور مجھے نہ معلوم ہوا ہو، اپنی زمینیں کرائے پر دینا بند کر دیں۔(بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابنِ ماجہ)

دیکھیے عبداللہ بن عمرؓ وہ شخص ہیں جن کی حقیقی بہن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں۔جن کے والد، حضرت عمرؓ، نبی ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے معتمد ترین وزیر رہے اور پھر خود دس سال تک اِسلامی حکومت کے خلیفہ رہے۔کیا یہ ممکن تھا کہ اُنھیں پورے زمانۂ نبوت اور پورے زمانۂ خلافتِ راشدہ میں یہ خبر نہ ہوتی کہ زمینوں کے بارے میں اِسلام کا قانون کیا ہے؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ حضرت عمرؓ کی زندگی میں ان کا اپنا بیٹا خود ان کی طرف سے اُن کے گھر کی زمین داری کا انتظام ایسے طریقے پر کرتا رہتا جو اِسلامی قانون میں ممنوع تھا[1]؟

---

[1] یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو یہ اطمینان تھا کہ مزارعت اور کرایۂ زمین ناجائز نہیں ہے تو پھر رافعؓ بن خدیجؓ کی روایت سن کر انھوں نے یہ طریقہ چھوڑ کیوں دیا؟ یہ بظاہر ایک شبہ میں ڈالنے والی بات ہے لیکن جو شخص حضرت ابنِ عمرؓ کی طبیعت اور ان کے مزاج سے واقف ہو وہ اس طرح کی کسی غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا۔واقعہ یہ ہے کہ ابنِ عمرؓ کے مزاج میں احتیاط وَرَع کی حد سے گزر کر تشدد تک پہنچ گئی تھی اور آخر عمر میں تو اس نے ایک حد تک وہم کی سی صورت اختیار کر لی تھی۔مثلاً وہ وضو میں اتنا مبالغہ کرتے تھے کہ آنکھوں کے اندرونی حصوں کو بھی دھویا کرتے تھے، یہاں تک کہ آخر کار اسی کی وجہ سے ان کی بینائی جاتی رہی۔اپنے بچوں کو اگر پیار کر لیتے تو پھر کلی کیے بغیر نماز نہ پڑھتے۔اگر دورانِ نماز میں امام کے ساتھ آ کر شامل ہوتے تو بعد میں صرف چھوٹی ہوئی نماز ہی ادا نہ کرتے بلکہ سجدۂ سہو بھی کرتے تھے۔(تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو زاد المعاد، جلد ۱، ص ۲۲۶) اس شدتِ احتیاط کی بِنا پر اگر انھوں نے رافع بن خدیجؓ کی حدیث سُن کر اپنی زمینیں کرائے پر دینا بند کر دیں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انھیں اس عمل کی صحت میں واقعی کوئی شک ہو گیا تھا جسے وہ پچاس برس تک زمانۂ نبوت و خلافتِ راشدہ میں کرتے رہے تھے اور جس پر اکابر صحابہ و خلفائے راشدین کو اور خود نبی ﷺ کو عمل کرتے (بقیہ حواشی اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

۲۔　ابنِ عمرؓ ہی کی روایت ہے، اور عبداللہ بن عباسؓ اور انسؓ بن مالک کی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا۔ اس کا کچھ حصہ صلحاً فتح ہوا اور کچھ بزورِ شمشیر مغلوب ہوا۔ آں حضرت ﷺ نے آدھے علاقے کو حکومت کی ضروریات کے لیے مخصوص فرما دیا اور آدھے علاقے کو اٹھارہ سو حصوں میں تقسیم کر کے ان پندرہ سو مجاہدین پر بانٹ دیا جو غزوۂ خیبر میں شریک تھے۔ (یعنی بارہ سو پیادوں کا اکہرا حصہ اور تین سو سواروں کا دوہرا حصہ) پھر آپ نے ارادہ فرمایا کہ یہودی باشندوں کو علاقہ مفتوحہ سے نکال دیں۔ مگر یہودیوں نے آ کر عرض کیا کہ آپ ہمیں یہاں رہنے دیں، ہم آپ کی طرف سے یہاں کاشت کریں گے، آدھی پیداوار آپ لے لیجیے گا اور آدھی ہم لے لیں گے۔ آں حضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر کہ آپ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے، ان کی بات مان لی، اور ان سے فرمایا کہ ہم جب تک چاہیں گے تمھیں رکھیں گے اور جب چاہیں گے تمھیں یہاں سے نکال دیں گے۔ چنانچہ ان شرائط پر آپ نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ کاشت کاروں کی حیثیت سے خیبر میں کام کرتے تھے۔ آدھی زمین کی مالک حکومت تھی اور بقیہ نصف کے مالک وہ پندرہ سو حصہ دار تھے جن پر اٹھارہ سو قطعات تقسیم کیے گئے تھے۔ بٹائی کے معاہدے کی رو سے جو نصف پیداوار وہاں سے آتی تھی اسے حکومت اور حصہ داروں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا حصہ بھی عام حصہ داروں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپ اس میں سے ہر سال ایک خاص مقدار میں غلہ اور کھجوریں اپنی ازواجِ مطہرات کو برابر برابر دیا کرتے تھے۔ یہ بندوبست حضور ﷺ کے آخر حیات تک جاری رہا۔ اسی پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمل کیا۔ اسی پر حضرت عمرؓ اپنے ابتدائی زمانہ میں کاربند رہے۔ پھر جب

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ)

دیکھ چکے تھے۔ اگر ان کے دل میں مزارعت کے جواز کے متعلق ذرہ برابر بھی کوئی شک ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ ان کی زبان سے یہ شکایت آمیز فقرہ نکلتا (جیسا کہ مسلم کی ایک روایت میں ہے) کہ

لقد منعنا رافع نفع ارضنا.

''رافعؓ نے ہمیں ہماری زمین کے نفع سے محروم کر دیا۔''

کیا کوئی شخص یہ توقع کر سکتا ہے کہ ابنِ عمرؓ کو اگر کسی درجہ میں بھی یہ گمان ہوتا کہ یہ واقعی رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے تو ان کی زبان اس پر حرفِ شکایت سے آلودہ ہو سکتی تھی؟

یہودیوں نے خیبر میں پیہم شرارتیں کیں اور حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ معاہدے کے مطابق ان کو وہاں سے نکال دیا جائے، تو آپ نے اعلان کیا کہ خیبر میں جس جس کا حصہ ہے وہ جا کر اپنی اپنی زمین سنبھال لے۔ ازواجِ مطہرات کے سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ میں سے جو جو پسند کریں وہ اتنی زمین لے لیں جس کی پیداوار اسی قدر ہو جس قدر غلہ اور ثمرہ آپ کو نبی ﷺ کے زمانے سے ملتا آ رہا ہے، اور جو چاہیں اپنے حصہ کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں اور اتنا ہی غلہ اور ثمرہ حکومت سے لیتی رہیں۔ اس تجویز کے مطابق بعض ازواجِ مطہرات نے غلہ اور ثمرہ پسند کیا۔ اور حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما نے زمین لے لی[1]۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر سے منتقل کر کے تیما اور اریحا میں بسا دیا۔

(بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ)

یہ عہدِ نبوت وخلافت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں صریح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دی ہے، اپنی طرف سے بھی، حکومت کی طرف سے بھی، اور ان پندرہ سو افراد کی طرف سے بھی جن کا حصہ خیبر میں تھا۔ اس طریقہ پر آپ اپنے آخری لمحۂ حیات تک عامل رہے، اور آپ کے بعد شیخین کا عمل بھی اسی پر رہا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اِسلامی قانون میں بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دینا ممنوع تھا؟

اس کے جواب میں جو لوگ کہتے ہیں کہ خیبر کا معاملہ بٹائی کا نہیں بلکہ خراج کا معاملہ تھا، ان کی بات صحیح نہیں ہے۔ خیبر کی آدھی زمین جو حکومت کی مِلک قرار دی گئی تھی اُس کی بٹائی تو بے شک خراج تھی۔ لیکن جو بقیہ نصف اراضی مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دی گئی تھیں ان کی بٹائی کو ''خراج'' کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ''خیبر کے یہودی باقاعدہ ذمی رعایا نہ تھے، کیوں کہ ان پر جزیہ نہیں لگایا گیا تھا، اس لیے مسلمان مجاز تھے کہ ان سے جو چاہتے لیتے،'' اُن کی بات بھی صحیح نہیں

---

[1] واضح رہے کہ یہ نبی ﷺ کی میراث نہیں تھی جو آپؐ کی ازواج میں تقسیم ہوئی، بلکہ آں حضرت ﷺ کی بیویوں کو چوں کہ تمام امت کی مائیں قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں آپؐ کے بعد نکاح سے روک دیا تھا اس لیے ان کا نفقہ امت پر واجب تھا۔

ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں جزیہ کے احکام غزوۂ خیبر کے وقت نازل ہی نہ ہوئے تھے۔ پھر بھلا احکامِ جزیہ کی غیر موجودگی میں جزیہ نہ عائد کیے جانے پر کسی قانونی استدلال کی بِنا کیسے رکھی جاسکتی ہے؟ اہلِ خیبر کا ذمی ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ اِسلامی حکومت نے انھیں ایک باضابطہ قرار داد کے مطابق اپنے ملک میں آباد رہنے دیا، ان پر خراج عائد کیا اور ان پر دیوانی وفوج داری قوانین اسی طرح نافذ کیے جس طرح وہ مسلمان رعایا پر نافذ کیے جارہے تھے۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ جب خیبر کی قرار داد ہو چکی اور مسلمان یہودیوں کی بستیوں میں چلنے پھرنے لگے تو بعض مسلمان یہودیوں پر کچھ دست درازی کر بیٹھے۔ اس کی شکایت یہودیوں نے نبی ﷺ سے کی۔ اس پر آپؐ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ ''اللّٰہ نے تمھارے لیے یہ حلال نہیں کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت گھسو اور ان کے بال بچوں کو مارو پیٹو اور ان کے پھل کھا جاؤ، حالانکہ جو کچھ ان پر واجب تھا وہ انھوں نے تمھیں ادا کر دیا ہے۔'' کیا یہ اہلِ خیبر کے ذمّی ہونے کی کھلی دلیل نہیں ہے؟ اِسلامی قانونِ فوج داری میں قسامت کے قاعدہ کا تو ماخذ ہی وہ واقعہ ہے جو خیبر میں ایک مسلمان کے خفیہ قتل کا پیش آیا تھا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کو قانون کی نگاہ میں مسلمانوں کے برابر حیثیت حاصل تھی۔ اگر کہا جائے کہ جب یہ بات تھی تو آیتِ جزیہ کے نزولِ کے بعد ان پر جزیہ کیوں لگایا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ نزولِ آیت سے پہلے ایک معاہدہ طے ہو چکا تھا ان پر ایک نئی شرط کا اضافہ کر دینا کیوں کر جائز ہوسکتا تھا۔ اگر کہا جائے کہ جب وہ ذمی تھے تو پھر انھیں خیبر سے نکالا کیوں گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا اخراج اس قرار دار کے مطابق تھا جو انھیں ذمی بناتے وقت ان سے طے ہو چکی تھی۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عمرؓ نے انھیں صرف حجاز سے نکالا تھا، سلطنت سے نہیں نکال دیا تھا۔ آپ نے سلطنت کے ایک حصہ سے انھیں منتقل کیا اور دوسرے حصے (یعنی تیما اور اَریحا) میں لے جا کر بسا دیا[1]۔

پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ معاملہ مزارعت کا نہیں تھا کیوں کہ اس میں مدت کا تعین نہ ہوا تھا، ان کی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ نبی ﷺ نے جو معاملہ ان سے طے کیا تھا اس میں من جملہ شرائط

---

[1] اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے علامہ ابن القیم کی زادالمعاد جلد دوم میں حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں۔ ص ۹، ۱۰۸، ۱۱۱، ۲۰۱۔۲۰۶۔

کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ

نقرکم بها علی ذالک ما شئنا.

''ہم اس قرارداد پر جب تک چاہیں گے تمھیں یہاں رکھیں گے۔''

اس میں مدت کا تعین بلحاظ وقت نہیں بلکہ بلحاظ مشیتِ مالک کیا گیا تھا اور یہ ان مخصوص حالات کی وجہ سے تھا جن میں اُس وقت یہودیوں سے معاملہ طے ہوا تھا۔ اتنی سی بات کی وجہ سے یہ فیصلہ کر دینا دُرست نہیں ہے کہ خیبر کا معاملہ سرے سے مزارعت کا معاملہ نظر آتا ہے[1]۔

(۳)　حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے (اور خیال رہے کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ وہی ہیں جن سے اوپر بٹائی اور لگان کی ممانعت اور خود کاشت کرنے یا مفت زمین دینے کی ہدایت نقل کی جا چکی ہے) کہ جب نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو انصار نے آکر عرض کیا:

اقسم بيننا وبين اخواننا النخل.

''آپ ہمارے نخلستانوں کو ہمارے درمیان اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان بانٹ دیں۔''

مگر آں حضرت ﷺ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انصار نے مہاجرین سے کہا:

تكفرنا العمل ونشرككم فی الثمرة.

''آپ لوگ ہماری طرف سے ان نخلستانوں میں کام کریں، اور ہم آپ کو ثمرہ میں شریک کریں گے۔''

اس پر مہاجرین نے کہا:

سمعنا واطعنا.

''یہ بات بخوشی منظور ہے۔'' (بخاری)

---

[1] واضح رہے کہ حنفیہ کے نزدیک مزارعت کے لیے مدت کا تعین ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ لسان الحکام میں ہے: **وفی النوازل عن محمد بن سلمة المزارعة من خير بيان المدة جائزة ايضًا** (ص۱۹۵) اور **الفقه علی المذاهب الاربعه** میں مذہب حنفی کے احکام بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: **ويصح عقد المزارعة بدون بيان المدة اذا كان وقت الزرع معروفا.** (جلد۳، ص۹)

(۴)　قیس بن مسلم حضرت ابوجعفر (یعنی امام محمد باقر رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ مدینے میں مہاجرین کا کوئی گھرانا ایسا نہ تھا جو تہائی یا چوتھائی حصہ پیداوار کے عوض کاشت نہ کرتا ہو۔ امام بخاری اس روایت کو نقل کرنے کے بعد پھر اس کی تائید میں مزید نظائر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بٹائی پر معاملہ حضرت علیؓ نے کیا ہے، سعد بن مالک اور عبداللہ بن مسعودؓ نے کیا ہے، عمر بن عبدالعزیز اور قاسم اور عروہ نے کیا ہے[۱]، آلِ ابوبکرؓ، آلِ علیؓ، آلِ عمرؓ[۲]، سب بٹائی پر کاشت کراتے رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ لوگوں سے اس طرح معاملہ کیا کرتے تھے کہ اگر ''عمرؓ اپنے پاس سے بیج دے گا تو آدھی پیداوار لے گا اور اگر کاشت کار اپنا بیج لائیں تو ان کا حصہ اتنا ہوگا[۳]۔''

(بخاری، باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ)

(۵)　حضرت ابوجعفرؒ (امام محمد باقر) کی ایک اور روایت ہے جس میں وہ تصریح کرتے ہیں کہ

کان ابوبکر یعطی الارض علی الشطر. (طحاوی)

''حضرت ابوبکرؓ اپنی زمین نصف نصف کی بٹائی پر زراعت کے لیے دیتے تھے۔''

(۶)　ابنِ ابی شیبہ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ

لاباس بالمزارعۃ بالنصف. (کنزل العمال)

''نصف نصف کی بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔''

(۷)　طاؤس کی روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ اپنی زمین نبی ﷺ کے زمانے میں اور آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں تہائی اور چوتھائی پیداوار کی بٹائی پر زراعت کے لیے دیتے رہے۔ (ابن ماجہ) اس حدیث میں غلطی صرف اتنی ہے کہ طاؤس نے حضرت عثمانؓ کے عہد کا بھی ذکر کر دیا ہے، حالانکہ حضرت معاذؓ کا انتقال حضرت عمرؓ کے زمانے میں

---

[۱] قاسم بن ابی بکر کے اثر کو پوری سند کے ساتھ عبدالرزاق نے اور باقی پانچوں بزرگوں کے آثار کو سند کے ساتھ ابنِ ابی شیبہ نے بیان کیا ہے۔

[۲] ان تینوں خاندانوں میں مزارعت کا رواج ہونے کی پوری سند عبدالرزاق اور ابنِ ابی شیبہ نے دی ہے۔

[۳] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمر کو پوری سند کے ساتھ ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے بیان کیا ہے۔

ہو چکا تھا۔ لیکن محض اس غلطی کی بِنا طاؤس جیسے شخص کی پوری روایت کو غلط نہیں کہا جا سکتا[1]۔ خصوصًا جب کہ اس روایت کی سند میں سب ثقہ لوگ ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ حضرت معاذؓ بن جبل وہ شخص ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی اور عامل زکوٰۃ مقرر فرمایا تھا، جن کے متعلق حضور ﷺ کا ارشاد تھا کہ:

اعلمهم بالحلال والحرام.

''وہ صحابہ میں سب سے زیادہ حلال وحرام کی واقفیت رکھتے ہیں۔''

اور جنھیں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کے بعد پورے شام کا فوجی گورنر مقرر کیا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ ایسے شخص کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ زمین کے بارے میں اِسلام کا قانون کیا ہے؟

(۸)　موسٰی بن طلحہؒ کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ، عمارؓ بن یاسر، خبابؓ بن اَرَتّ، اور سعدؓ بن مالک کو زمینیں عطا کی تھیں۔ ان میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور سعدؓ بن مالک اپنی زمینیں تہائی اور چوتھائی پیداوار کی بٹائی پر کاشت کے لیے دیتے تھے۔

(کتاب الخراج لابی یوسف)

ان شواہد و نظائر سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مزارعت کا طریقہ عہد نبوت و خلافتِ راشدہ میں بالعموم رائج تھا۔ خود نبی ﷺ اور خلفائے راشدین، اور صحابہؓ کے تمام زراعت پیشہ گھرانے اس پر عامل تھے، اور رافع بن خدیجؓ وغیرہ حضرات کی روایات پھیلنے تک پورے ۵۰ سال کے دَوران میں کسی کو یہ بات سرے سے معلوم ہی نہ تھی کہ اس معاملہ میں کسی قسم کے امتناعی احکام موجود ہیں۔

---

[1] طاؤس کے متعلق محدثین بالعموم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت معاذؓ کے حالات سے وہ خوب واقف تھے اور ان کے بارے میں ان کی روایات مستند ہیں اگرچہ وہ ان سے ملے نہیں تھے۔ چنانچہ امام شافعی لکھتے ہیں: **طاؤس عالم بامر معاذ وان لم یلقه لکثرة من لقیه ممن ادرک معاذا.** اور ابن حُجر اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس پر اضافہ کرتے ہیں کہ: **وهذا مما لا اعلم عن احد فیه خلافًا.**

تنقید بلحاظ عقل و درایت

اب ذرا اس معاملہ کو ایک دوسرے رُخ سے بھی دیکھیے۔ اِسلام کے احکام ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے سے متناقض و متصادم نہیں ہیں۔ اس کی ہدایت اور اس کے قوانین میں سے ہر چیز اس کے مجموعی نظام میں اس طرح ٹھیک بیٹھتی ہے کہ دوسرے تمام احکام و قوانین کے ساتھ اس کا جوڑ مل جاتا ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس دین کے من جانب اللہ ہونے کا ایک نمایاں ثبوت قرار دیا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ مان لیں کہ شریعت میں مزارعت ناجائز ہے اور یہ کہ شارع زمین کی ملکیت کو خود کاشتی تک محدود کرنا چاہتا ہے، اور یہ کہ شارع آدمی کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ خود کاشتی کی حد سے زائد جتنی زمین اس کے پاس موجود ہو اسے یا تو دوسروں کو مفت دے دے یا بے کار ڈال رکھے، تو ذرا سا غور کرنے پر ہمیں علانیہ یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ احکام اِسلام کے دوسرے اصول اور قوانین سے مناسبت نہیں رکھتے اور انھیں اِسلامی نظام میں ٹھیک بٹھانے کے لیے دُور دُور تک اس نظام کی بہت سی چیزوں میں ترمیم ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر تناقض کی چند نہایت صریح صورتیں ملاحظہ ہوں:

(۱)　اِسلامی نظام میں ملکیت کے حقوق صرف ہٹے کٹے مردوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ عورتوں، بچوں، بیماروں اور بوڑھوں کو بھی یہ حقوق پہنچتے ہیں۔ اگر مزارعت ممنوع ہو تو ان سب کے لیے زرعی ملکیت بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

(۲)　اِسلامی قانونِ وراثت کی رُو سے جس طرح ایک آدمی کی میراث اس کے مرنے پر بہت سے آدمیوں کے درمیان بٹ جاتی ہے، اسی طرح بسا اوقات بہت سے مرنے والوں کی میراث ایک آدمی کے پاس جمع بھی ہو سکتی ہے۔ اب یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اِسلام کا قانونِ وراثت تو بیسیوں اور سیکڑوں ایکڑ تک زمین ایک شخص کے پاس سمیٹ لائے، مگر اس کا قانونِ زراعت اس کے لیے ایک محدود رقبے کے سوا باقی تمام ملکیت سے انتفاع کو حرام قرار دے۔

(۳)　اِسلامی قانونِ بیع وشرا نے کسی نوعیت کی جائز اشیا کے معاملہ میں بھی انسان پر یہ پابندی عائد نہیں کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص حد تک ہی انھیں خرید سکتا ہو اور اس حد سے زیادہ کی خریداری کا مجاز نہ ہو۔ خرید وفروخت کا یہ غیر محدود حق جس طرح تمام جائز چیزوں کے معاملہ میں آدمی کو حاصل ہے اسی طرح زمین کے معاملہ میں بھی حاصل ہے لیکن یہ بات پھر نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ دیوانی قانون کی رُو سے تو ایک شخص جتنی چاہے زمین خرید سکے، مگر قانونِ زراعت کی رُو سے وہ ایک حد خاص سے زائد ملکیت کا نفع اُٹھانے کا حق دار نہ ہو۔

(۴)　اِسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق وواجبات ادا کیے جاتے رہیں، بلا حد ونہایت رکھی جاسکتی ہے۔ روپیہ پیسہ، جانور، استعمالی اشیا، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بِنا پر صرف اس ایک معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ آدمی کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے، یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حدِ خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لیے عملاً بے کار کر دیا جائے[1]۔

(۵)　اِسلام نے احسان اور فیاضی کی تعلیم تو زندگی کے ہر معاملہ میں دی ہے، لیکن واجبی حقوق وصول کر لینے کے بعد پھر کسی معاملہ میں بھی ہم اس کا یہ طریقہ نہیں دیکھتے کہ وہ فیاضی کو آدمی پر فرض قرار دیتا ہو۔ مثلاً جو شخص زکوٰۃ ادا کر چکا ہے، اِسلام اسے یہ ترغیب تو ضرور دیتا ہے کہ وہ اپنا ضرورت سے زائد روپیہ حاجت مند لوگوں کو بخش دے، مگر وہ اس بخشش وسخاوت کو فرض نہیں کرتا اور نہ یہ کہتا ہے کہ حاجت مند کو قرض کی شکل میں روپیہ دینا، یا مضاربت کے اُصول پر روپیہ دے کر اس کے کاروبار میں شریک ہو جانا حرام ہے، بلکہ مدد صرف عطا اور بخشش ہی کی شکل میں ہونی

---

[1] اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام کا اصولی قانون تو یہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کیا ہے۔ البتہ کسی خاص حالت میں یہ ضرورت محسوس ہو کہ زمین کی زیادہ سے زیادہ ملکیت کے لیے مقدار کی ایک حد مقرر کی جائے تو عارضی طور پر اتنی مدت کے لیے ایسا کیا جاسکتا ہے جب تک وہ ضرورت باقی رہے۔ لیکن اس طرح کے کسی فیصلے سے اسلام کے اصولی قانون میں کوئی مستقل ترمیم نہیں ہوسکتی۔ آگے چل کر ہم اس مسئلے پر مفصل بحث کر رہے ہیں۔

چاہیے۔ اسی طرح مثلاً جس شخص کے پاس ضرورت سے زائد مکانات ہوں، یا ایک بڑا مکان اس کی ذاتی ضرورت سے زیادہ کی گنجائش رکھتا ہو، اِسلام بہت پسند کرتا ہے کہ آدمی اپنے ایسے مکانات اور گنجائشوں سے ان لوگوں کو فائدہ اُٹھانے کا مفت موقع دے دے جو گھر نہ رکھتے ہوں۔ لیکن اس نے یہ نہیں کہ یہ موقع لازمًا مفت ہی دیا جانا چاہیے، کرایہ پر مکان دینا حرام ہے۔ ایسا ہی معاملہ ضرورت سے زائد کپڑوں، برتنوں اور سواریوں وغیرہ کا بھی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو فیاضانہ طریقہ سے مفت دے دینا پسند تو ضرور کیا گیا ہے مگر فرض نہیں کیا گیا اور فروخت کرنے یا کرایہ پر دینے کو حرام نہیں ٹھہرایا گیا۔ اب آخر زرعی زمین میں وہ کیا خصوصیت ہے جس کی بِنا پر صرف اسی کے معاملہ میں اِسلام اپنے اس عام اصول کو بدل دے اور آدمی سے اس کی پیداوار پر زکوٰۃ وصول کر لینے کے بعد اسے اس بات پر بھی مجبور کرے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد زمین لازمًا دوسروں کو مفت دے دے اور شرکت یا مضاربت کے اصول پر ان سے معاملہ ہرگز نہ کرے۔

۶۔　اِسلامی قانون نے تجارت، صنعت، اور معاشی کاروبار کے تمام شعبوں میں آدمی کو اس بات کی کھلی اجازت دی ہے کہ وہ نفع ونقصان کی شرکت کے اصول پر دوسروں کے ساتھ معاملہ کر لے۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا روپیہ دے سکتا ہے اور طے کر سکتا ہے کہ تو اس سے کاروبار کر، نفع ہو تو اس میں آدھے یا چوتھائی، کا مَیں حق دار ہوں۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا سرمایہ کسی عمارت کی شکل میں، کسی مشین یا انجن کی شکل میں، کسی موٹر یا کشتی یا جہاز کی شکل میں بھی دے سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ تو اس پر کام کر، جو نفع ہو اس میں میرا اتنا حصہ ہے لیکن آخر اس بات کے لیے کون سے معقول وجوہ ہیں کہ ایک شخص اپنا سرمایہ زمین کی شکل میں دوسرے کو دے کر یہ نہ کہہ سکے کہ تو اس میں کاشت کر، پیداوار میں تہائی یا چوتھائی یا نصف کا مَیں شریک ہوں؟

یہ چند نمایاں ترین مثالیں ہیں جن پر نگاہ ڈال کر آدمی بیک نظر دیکھ سکتا ہے کہ یہ مزارعت کی حرمت اور یہ خود کاشتی کی قید، اور یہ ملکیتِ زمین کے لیے رقبے کی حد بندی اِسلام کے مجموعی نظام میں کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ اسے کھپانا ہو تو دوسرے بہت سے اصول وقوانین کو بدلنا پڑے گا۔ دوسرے اصول وقوانین اپنی جگہ رہیں تو یہ ہر قدم پر ان سے متصادم ہوتی رہے گی۔

امتناعی احکام کا اصل مفہوم

پھر کیا نقل اور عقل کے ان دلائل کی بِنا پر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ وہ تمام احادیث غلط ہیں جو اس کثرت سے ثقہ راویوں نے اتنے صحابیوں سے روایت کی ہیں؟ نہیں، اصل بات یہ نہیں ہے کہ یہ روایتیں جھوٹی یا ضعیف ہیں۔ اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ ان میں ادھوری بات بیان ہوئی ہے جس کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ خود رافعؓ بن خدیج اور جابرؓ بن عبداللّٰہ وغیرہ حضرات کی دوسری روایتیں جب ہمارے سامنے آتی ہیں، اور بعض دوسرے جلیل القدر صحابہ کی توضیحات کو جب ہم دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل نبی ﷺ نے فرمایا کچھ اور تھا اور وہ روایات میں بیان کسی اور طرح ہو گیا۔

رافعؓ بن خدیج کی توضیحات

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، امیر معاویہؓ کے ابتدائی دَورِ حکومت تک تمام بلادِ اسلامیہ میں بالعموم سب ہی بٹائی اور لگان کا معاملہ کرتے تھے اور کسی کو یہ گمان تک نہ تھا کہ اس میں کسی قسم کی شرعی قباحت ہے۔ اس لیے جب ۵۰ھ کے لگ بھگ زمانہ میں یکا یک یہ خبر مشہور ہوئی کہ بعض صحابی اس چیز کی ممانعت کا حکم نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں تو ہر طرف ایک کھلبلی سی مچ گئی اور لوگ مجبور ہوئے کہ صحابۂ کرام کے پاس جا کر تحقیق کریں کہ نبی ﷺ نے فی الحقیقت کیا حکم دیا ہے، کن حالات میں دیا ہے، اور کس چیز کے متعلق دیا ہے؟ اس سلسلہ میں خود ان صحابیوں سے بھی پوچھ گچھ کی گئی جن سے مزارعت اور کرایۂ زمین کی ممانعت کے احکام مروی ہوئے تھے، اور دوسرے صحابہ سے بھی پوچھا گیا۔ اس طرح جو بات کھلی وہ ہم ذیل میں خود انھی بزرگوں کی زبان سے نقل کرتے ہیں۔

حنظلہ بن قیس کہتے ہیں، مَیں نے رافع بن خدیجؓ سے پوچھا سونے اور چاندی کی شکل میں زمین کا کرایہ طے کرنا کیسا ہے؟ انھوں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مزید تشریح کے طور پر فرمایا:

انما کان الناس یواجرون علیٰ عھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

علٰی الماذیانات واقبال الجد اول و اشیاء من الزرع فیھلک ھٰذا ویسلَم ھٰذا ویسلم ھٰذا ویھلک ھٰذا، فلم یکن للناس کراء الا ھٰذا فلذالک زجر عنه، واماشئ معلوم مضمون فلا باس به. (مسلم،ابوداؤد،نسائی)

''اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں لوگ اپنی زمینیں اجرت پر دیتے ہوئے یہ طے کیا کرتے تھے کہ پانی کی نالیوں کے سرے پر اوران کے کناروں پر اور کھیت کے بعض مخصوص حصوں میں جو پیداوار ہوگی وہ مالک زمین لے گا۔اب کبھی ایسا ہوتا کہ ایک جگہ کی کھیتی برباد ہوتی اور دوسری جگہ کی بچ جاتی اور کبھی اس جگہ کی بچ جاتی اور اس جگہ کی برباد ہوجاتی۔اس زمانہ میں زمینیں کرائے پر دینے کا کوئی دوسرا دستور اس کے سوا نہ تھا۔اسے نبی ﷺ نے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔رہا ایک واضح اور متعین حصہ،تو اس پر معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

حنظلہ بن قیس کی دوسری روایت میں رافع بن خدیجؓ کے الفاظ یہ ہیں:

کنانکری الارض بالناحیة منھا مسمّی لسید الارض قال فمھما یصاب ذالک وتسلم الارض ومھما یصاب الارض ویسلم ذالک، فنھینا. واما الذھب والورق فلم یکن یومئذٍ. (بخاری)

''ہم لوگ زمینیں اس طرح کرایہ پر دیتے تھے کہ مالک زمین کھیت کے ایک خاص حصہ کی پیداوار کو اپنے لیے مخصوص کرلیتا تھا۔اب کبھی ایسا ہوتا کہ اسی حصہ پر آفت آجاتی اور باقی زمین بچ جاتی اور کبھی ایسا ہوتا کہ وہی حصہ بچ جاتا اور ساری زمین پر آفت آجاتی۔ اسی لیے ہمیں ایسا معاملہ کرنے سے روک دیا گیا۔رہا سونا چاندی تو اس پر معاملہ کرنے کا اس زمانہ میں دستور ہی نہ تھا۔''

حنظلہ بن قیس کی تیسری روایت میں یہ ذکر ہے کہ حضرت رافعؓ نے فرمایا:

حدثنی عمای انھم کانوا یکرون الارض علی عھد النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم بما ینبت علٰی الاربعاء اوشئ یستثنیهِ صاحب الارض فنھی النبی

صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن ذالک. فقلت لرافع فکیف ھی بالدینار والدرھم فقال رافع لیس بھا باس بالدینار والدرھم. (بخاری، احمد، نسائی)

''میرے دو چچاؤں نے مجھ سے بیان کیا کہ نبی ﷺ کے زمانہ میں لوگ اپنی زمینوں کو اس پیداوار کے عوض کرایہ پر دیتے تھے جو پانی کی نالیوں پر پیدا ہو یا زمین کے کسی ایسے حصے میں پیدا ہو جسے مالک زمین مستثنیٰ کر لیتا تھا۔ اس طریقے کو نبی ﷺ نے منع فرما دیا۔ اس پر مَیں نے رافع سے پوچھا کہ دینار اور درہم کے عوض معاملہ کرنا کیسا ہے؟ رافعؓ نے کہا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

حضرت رافع رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت جو حنظلہ الزرقی کے واسطہ سے آئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

کنا اکثر الانصار حقلًا، کنا نکری الارض علیٰ ان لنا ھٰذہٖ ولھم ھٰذہٖ فربما اخرجت ھذہ ولم تخرج ھٰذہٖ فنھانا عن ذالک واما الورق فلم ینھنا. (مسلم، ابن ماجہ، بخاری، مگر بخاری میں ''اما الورق فلم ینھنا'' کے الفاظ نہیں ہیں)

''ہم لوگ انصار میں سب سے زیادہ کھیتی باڑی کرنے والے تھے۔ ہم زمین اس طرح کرایہ پر دیا کرتے تھے کہ کھیت کے اس حصہ کی پیداوار ہماری اور اس حصے کی پیداوار تمھاری۔ اب کبھی ایسا ہوتا کہ ایک حصے میں فصل ہوتی اور دوسرے میں نہ ہوتی۔ اس وجہ سے نبی ﷺ نے ہمیں یہ معاملہ کرنے سے منع فرما دیا۔ رہا چاندی کے عوض معاملہ کرنا تو اس سے آپ نے منع نہیں فرمایا۔''

خود رافع بن خدیجؓ کے چچازاد بھائی اُسید بن ظہیر روایت کرتے ہیں:

کان احدنا اذا استغنٰی عن ارضہ اوافتقر الیھا اعطاھا بالثلث والربع والنصف واشترط ثلٰث جد اول والقصارۃ وما یسقی الربیع وکان العیش اذ ذاک شدیدًا وکان یعمل فیھا بالحدید و بما شاء اللّٰہ ویصیب منھا منفعۃ فاتانا رافع بن خدیج فقال ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ

علیه وسلم نها کم عن امر کان لکم نافعًا وطاعة اللّٰه وطاعة رسوله انفع لکم ان رسول اللّٰه ینهاکم عن الحقل ویقول من استغنیٰ عن ارضه فلیمنحها اخاه اولیدع. (ابوداؤد، احمد، نسائی، ابن ماجہ)

''ہم میں سے کوئی شخص جب اپنی زمین سے بے نیاز ہوتا، یا اسے کرائے پر دینے کا حاجت مند ہوتا تو اسے تہائی یا چوتھائی یا نصف پیداوار کی بٹائی پر دوسرے کو دے دیتا تھا اور ساتھ ہی شرط کر لیتا تھا کہ تین نالیاں اور گانٹھیں (یا گھنڈیاں[1]) اور بڑی نالی کے کنارے کی پیداوار اس کی ہے۔ اس زمانہ میں زندگی بڑی سخت تھی۔ آدمی دن بھر ہل چلاتا یا دوسرا کام کرتا تب تھوڑا سا فائدہ حاصل کرتا تھا۔ ایک دن رافع بن خدیج ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ نے تم کو ایسے کام سے روک دیا ہے جو تمھارے لیے نافع تھا۔ مگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تمھارے لیے زیادہ نافع ہے۔ رسول اللہ ﷺ تمھیں زمینیں کرایہ پر دینے سے منع فرماتے ہیں، اور آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو اپنی زمین سے مستغنی ہو وہ یا تو اپنے بھائی کو مفت دے دے یا یوں ہی رہنے دے[2]۔''

جابرؓ بن عبداللہ کی توضیح

رافع بن خدیج کی طرح حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے بھی جب معاملہ کی تفصیلات دریافت کی گئیں تو اصل معاملہ جس سے نبی ﷺ نے منع فرمایا تھا، یہ کھلا:

---

[1] لغت میں قصارٰی اور قصرٰی سے مراد ہے **بقیة الحب فی سنبل بعد ما یداس** ۔یعنی وہ غلہ جو کھلیان کے بعد بالیوں میں بچا رہتا ہے۔ مَیں خود ایک ''غیر زراعت پیشہ'' آدمی ہوں، اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ اردو میں اسے کیا کہتے ہیں۔ میرے جیل کے دونوں رفیق ماشاءاللہ زراعت پیشہ ہیں ان کے اعتماد پر مَیں نے اس لفظ کا ترجمہ ''گانٹھ'' ''گھنڈی'' لکھ دیا ہے۔ گانٹھ کے راوی مولانا امین احسن صاحب اور گھنڈی کے راوی طفیل محمد صاحب ہیں۔ غالباً یہ فرق پنجاب اور یو۔ پی کی اصطلاحوں کا ہے۔

[2] اس جگہ یہ معلوم کرنا بھی شاید دل چسپی سے خالی نہ ہو کہ رافع بن خدیج کی عمر نبی ﷺ کی وفات کے وقت بمشکل ۲۲ سال کی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک انیس بیس سال کے نوجوان کا آں حضرت ﷺ کی بات کو سننے اور سمجھنے اور دوسروں سے جا کر روایت کرنے میں تھوڑی بہت غلطی کر جانا کچھ بہت زیادہ مستبعد امر نہ تھا۔

کنا نخابر علٰی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فنصیب من القُصریٰ ومن کذا ومن کذا، فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم من کان له ارض فلیزرعها اولیحرثها اخاه والا فلیدَعها. (احمد، مسلم)

''ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بٹائی پر زمینیں کاشت کے لیے دیتے تھے اور کچھ گانٹھوں (یا گھنڈیوں) میں سے اور کچھ اس چیز میں سے اور کچھ اس چیز میں سے بھی وصول کرتے تھے۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو اسے چاہیے کہ یا خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو کاشت کرا دے ورنہ اپنی زمین پڑی رہنے دے۔''

زیدؓ بن ثابت کی توضیح

حضرت زیدؓ بن ثابت سے جب عروہ بن زبیر نے معاملہ کی تحقیق کی تو انھوں نے فرمایا:

یغفر اللّٰه لرافع بن خدیج انا واللّٰه اعلم بالحدیث منه، انما اتٰی رجلان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم وقد اقتتلا، فقال ان کان هٰذا شانکم فلا تکر والمزارع، فسمع رافع بن خدیج قوله فلا تکر والمزارع. (ابوداؤد، ابن ماجہ)

''خدا معاف کرے رافع بن خدیج کو، مَیں اس بات کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اصل بات یہ تھی کہ دو آدمی نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوئے جن کے درمیان سخت جھگڑا ہوا تھا۔ اس پر حضور نے فرمایا اگر تم لوگوں کا یہ حال ہے تو اپنی زمینیں کرایہ پر نہ دیا کرو۔ رافع نے حضور کی بس اتنی بات سن لی کہ ''اپنی زمینیں کرایہ پر نہ دیا کرو۔''

سعدؓ بن ابی وقاص کی توضیحات

حضرت سعدؓ نے اس معاملہ کی جو حقیقت بیان کی وہ یہ ہے:

ان اصحٰب المزارع فی زمن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کانو یکرون مزارعهم بما یکون علی السواقی وما سعد بالماء مما حول النبت فجاؤا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فاختصموا فی بعض ذالک فنها

هم ان یکروا بذالک وقال اکروا بالذهب والفضة. (احمد،نسائی)

''نبی ﷺ کے زمانہ میں مالکانِ زمین کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی زمینیں اس شرط پر زراعت کے لیے دیتے تھے کہ نالیوں کے دونوں جانب کی پیداوار، اور کھیتی کے اس حصہ کی پیداوار جس پر پانی خود پہنچ جائے، مالک زمین کی ہوگی۔ اس پر لوگوں کے جھگڑے ہوئے اور ان کے مقدمات رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ تب آپ نے ایسی شرطوں پر زمینیں دینے سے منع فرمادیا اور فرمایا کہ سونے اور چاندی کی شکل میں کرایہ طے کرو۔''

دوسری روایت میں وہ فرماتے ہیں:

کنا نکری الارض بما علٰی السواقی من الزرع وما سعد بالماءِ منها فنهانا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن ذالک وامرنا ان کریها بذهب اوفضة. (ابوداؤد)

''ہم لوگ زمینیں اس شرط پر زراعت کے لیے دیتے تھے کہ کھیتی کا جو حصہ نالیوں کے کناروں پر ہے اور جس پر پانی خود پہنچ جائے اس کی پیداوار مالک کی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ایسا معاملہ کرنے سے ہمیں روک دیا اور حکم دیا کہ سونے اور چاندی کی شکل میں کرایہ طے کریں۔''

ابنِ عباسؓ کی توضیحات

تابعین میں جو فقہا سب سے زیادہ مشہور ہیں ان میں سے ایک حضرت طاؤس ہیں۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو معلومات حاصل کی ہیں وہ اس مسئلے پر سے باقی ماندہ پردے بھی اٹھادیتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

لما سمع اکثار الناس فی کراء الارض قال سبحان اللّٰه، انما قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الامنحها احدکم اخاه (ای قاله تحریضًا للناس علی الاحسان) ولم ینه عن کرائها. (ابن ماجہ)

''ابنِ عباس نے جب کرایۂ زمین کے بارے میں سنا کہ لوگوں میں بہت چہ میگوئیاں ہو

رہی ہیں تو انھوں نے کہا سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی زمین اپنے بھائی کو مفت کیوں نہیں دے دیتا (یعنی آپ لوگوں کو احسان کی ترغیب دینا چاہتے تھے) آپ نے کرایہ پر دینے سے منع نہیں فرمایا تھا۔''

دُوسری مفصل روایت میں یہ ہے کہ طاؤس اپنی زمینیں بٹائی پر دیا کرتے تھے۔اس پر مجاہد نے ان سے کہا کہ چلو رافعؓ بن خدیج کے بیٹے کے پاس چلیں، وہ اپنے والد سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں۔مگر طاؤس نے انھیں ڈانٹ دیا اور کہا خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کام سے منع فرمایا ہے تو میں اسے ہرگز نہ کرتا۔لیکن جو شخص رافع بن خدیجؓ سے زیادہ علم رکھتا ہے، یعنی ابنِ عباسؓ، اس نے مجھ سے کہا کہ:

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لان یمنح الرجل اخاہ ارضہ خیر لہ من ان یاخذ علیھا خرجا معلومًا.

''رسول اللہ ﷺ نے دراصل یہ فرمایا تھا کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو یوں ہی زمین دے دے تو یہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ اس پر ایک مقرر لگان لے۔''

دوسری روایت میں ابنِ عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں:

ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لم ینہ عنھا، انما قال یمنح احدکم اخاہ خیر لہٗ من ان یاخذ علیھا خرجا معلومًا.

''نبی ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا تھا۔آپ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو یوں ہی زمین دے دے تو یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اس پر ایک مقرر لگان وصول کرے۔''

ایک اور روایت میں ابنِ عباس کے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

لم یحرم المزارعۃ ولکن امر ان یرفق بعضھم ببعض.

''حضور ﷺ نے مزارعت کو حرام نہیں کر دیا تھا بلکہ آپؐ نے یہ ہدایت فرمائی تھی کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کا برتاؤ کریں۔'' (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی)

تحقیقِ مسئلہ

ان تمام شہادتوں اور عقلی ونقلی دلائل پر ایک جامع نگاہ ڈالنے سے مسئلے کی جو حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے وہ یہ ہے:

۱۔ اِسلام اس تخیل سے قطعی نا آشنا ہے کہ زرعی جائداد کی ملکیت دوسری اقسام کی املاک اور جائدادوں سے کوئی الگ نوعیت رکھتی ہے جس کی بِنا پر اُن سب کے برعکس اس کی جائز ملکیت کے لیے رقبے کے لحاظ سے کوئی حد مقرر کر دی جائے، یا یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ ہر شخص اور خاندان کے قبضے میں صرف اُتنی ہی زمین رہنی چاہیے جس میں وہ خود کاشت کر سکے، یا خود کاشتی سے زائد ملکیت کا حق دینے کے بعد دوسری ایسی پابندیاں لگا دی جائیں جن کی وجہ سے یہ حق بے معنی ہو کر رہ جائے۔ ایسی حد بندیوں کے لیے فی الحقیقت کتاب و سنت میں کوئی اصل موجود نہیں ہے۔

۲۔ جو شخص خود کاشت نہ کرے، یا نہ کر سکتا ہو، یا خود کاشتی کی حد سے زائد زمین رکھتا ہو، اس کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اپنی زمین دوسرے لوگوں کو زراعت کے لیے دے اور پیداوار میں تہائی یا چوتھائی یا نصف، جس پر بھی فریقین میں معاہدہ ہو، اپنا حصہ مقرر کر لے۔ جس طرح تجارت، صنعت اور دوسرے کاروباری معاملات میں مضاربت جائز ہے، بالکل اسی طرح زراعت میں مزارعت بھی جائز ہے۔

۳۔ لیکن مضاربت کی طرح مزارعت بھی صرف اپنی سادہ صورت ہی میں جائز ہے، یعنی یہ کہ مالک زمین اور کاشت کار کے درمیان حصے کا تعین سیدھے سیدھے طریقہ سے اس طرح ہو کہ زمین میں جتنی پیداوار بھی ہوگی وہ اس تناسب سے فریقین میں تقسیم ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ایسی کوئی شرط لگانا جس سے ایک فریق کا حصہ متعین اور دوسرے کا حصہ مشتبہ ہو، یا جس میں کسی ایک کا یا دونوں کا حصہ محض بخت و اتفاق پر منحصر ہو جائے، پورے معاملہ کو ناجائز کر دیتا ہے، کیوں کہ اس طرح کی شرطیں مزارعت میں سود خواری اور قمار بازی کی

خصوصیات پیدا کر دیتی ہیں۔

۴۔ رہا نقد لگان، تو اگر وہ کرایۂ زمین کی نوعیت رکھتا ہو تو جائز ہے، لیکن اگر پیداوار کا تخمینہ کر کے مالک زمین اُس میں اپنا حصہ پیشگی ایک مخصوص رقم کی شکل میں وصول یا متعین کر لے تو اصولاً اس میں اور سود خواری میں کوئی فرق نہیں۔ کرایہ میں لحاظ صرف اس امر کا ہونا چاہیے کہ مالک اپنی چیز کو کرایہ دار کے لیے مہیا کرنے اور مہیا رکھنے کا، اور اس نقصان کا جو کرایہ دار کے استعمال سے اس کی چیز کو پہنچتا ہے، معاوضہ طلب کرے۔ وہ چیز خواہ مکان ہو، یا فرنیچر، یا سواری یا زمین، بہر حال اس پہلو سے اس کا معاوضہ یقیناً لیا جا سکتا ہے، اور زیادہ نقصان دہ یا کم نقصان دِہ استعمال کے لحاظ سے اس معاوضہ میں کمی و بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر چیز کا مالک معاوضہ کا تعین اس لحاظ سے کرے کہ کرایہ دار میری چیز کو جس معاشی کاروبار میں استعمال کر رہا ہے اس میں اندازًا اُسے اتنا نفع ہوگا، لہٰذا اس میں سے مجھے اتنا معاوضہ لازمًا ملنا چاہیے، تو یہ پورا معاوضہ قطعی سود ہو جائے گا۔ خواہ وہ اس طریقے پر مکان کے معاملہ میں طے کیا جائے، یا سواری کے معاملہ میں، یا زمین کے معاملہ میں۔ کرایہ دار کے منافع میں حصہ لینے کی نیت جو شخص رکھتا ہو اسے سیدھی طرح مضاربت کرنی چاہیے اگر وہ تجارت و صنعت کے نفع میں شریک ہونا چاہتا ہے، یا مزارعت کرنی چاہیے اگر وہ زراعت کے نفع میں حصہ بٹانا چاہتا ہے، لیکن ایک فریق کا حصہ ایک مخصوص رقم کی شکل میں معین ہو اور دوسرے کا حصہ مشتبہ اور بخت و اتفاق پر منحصر رہے، یہ نہ تجارت صنعت میں جائز ہے اور نہ زراعت میں۔

فقہا کے مذاہب

آخر میں ایک نظر یہ بھی دیکھ لیجیے کہ اس مسئلے میں فقہائے اِسلام کے مختلف مذاہب کا فتویٰ کیا ہے۔ علامہ شوکانی اپنی کتاب نیل الاوطار میں لکھتے ہیں:

''حازمی کہتا ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعودؓ، عمار بن یاسر، سعیدؓ بن مسیّب، محمدؒ بن سیرین، عمرؒ بن عبدالعزیز، ابن ابی لیلیٰ، ابنِ شہاب زُہری، اور حنفیہ میں سے قاضی

ابو یوسف اور محمد بن حسن کہتے ہیں کہ کھیت کی پیداوار اور باغ کے ثمرے، دونوں کی بٹائی پر مالکِ زمین اور کاشت کار کے درمیان اور مالکِ باغ اور باغ بان کے درمیان معاملہ ہوسکتا ہے[1]۔ یہ دونوں معاملے ایک ساتھ بھی ہو سکتے ہیں جس طرح خیبر میں کیے گئے تھے کہ ایک ہی گروہ سے باغوں کی رکھوالی اور زمینوں کی کاشت کا معاملہ یک جا طے ہوا تھا، اور الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں۔ جن احادیث میں مزارعت کی نہی وارد ہوئی ہے ان کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ وہ دراصل تنزیہ پر مبنی ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہ صورت ہے جب کہ مالک زمین نے زمین کے کسی خاص حصے کی پیداوار اپنے لیے مخصوص کی ہو۔

اور طاؤس اور ایک قلیل گروہ کہتا ہے زمین کا کرایہ مطلقاً ناجائز ہے خواہ وہ زمین کی پیداوار کے ایک حصے کی شکل میں ہو، یا سونے اور چاندی کی شکل میں، یا کسی اور صورت میں[2]۔ اسی رائے کی طرف ابنِ حزم گئے ہیں اور انھوں نے بڑے زور سے اس کی تائید کی ہے اور اپنی حجت میں ان احادیث سے استدلال کیا ہے جو اس کی مطلقاً ممانعت کرتی ہیں[3]۔

اور شافعیؒ اور ابوحنیفہؒ اور عترت (یعنی فقہائے امامیہ) اور بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ زمین کا کرایہ ان تمام شکلوں میں طے کرنا جائز ہے جو اشیا کی خرید و فروخت کے لیے قیمت کا کام دے سکتی ہیں، خواہ وہ سونا ہو، چاندی ہو، استعمالی سامان ہو، یا غلہ ہو۔ لیکن یہ کرایہ خود اس زمین کی

---

[1] ان بزرگوں کے علاوہ صحابہ میں سے حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، سعدؓ بن ابی وقاص، زبیرؓ بن العوام، اسامہؓ بن زید، معاذؓ بن جبل، ابنِ عمرؓ، خبابؓ بن ارت، اور ابنِ عباسؓ سے اور فقہا میں طاؤس، اَوزاعی اور ثوری سے بھی یہی مذہب منقول ہے۔ ان میں سے اکثر کے حوالے سے ہماری پچھلی نقل کردہ روایات میں گزر چکے ہیں۔

[2] تعجب ہے کہ طاؤس کی طرف مزارعت کے عدم جواز کا مسلک یہاں کیسے منسوب کر دیا گیا۔ طاؤس کا مذہب تو یہ تھا کہ وہ بٹائی کو جائز اور نقد لگان کو ناجائز کہتے تھے۔ (نیل الاوطار، جلد ۵، ص ۲۴۶)

[3] ابنِ حزم کی طرف بھی اس مذہب کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ محلّٰی میں ابنِ حزم خود لکھتے ہیں:

''زمین کو نصف، ثلث یا رُبع پیداوار کے بدلے بٹائی پر دینا حدیث خیبر سے ثابت ہے۔ یہ آپ کا آخری عمل تھا جو وفات تک جاری رہا اور آپ کے بعد ابوبکرؓ، عمرؓ اور تمام صحابہ نے اس پر عمل درآمد کیا۔ لہٰذا یہ آپ کا آخری فعل ان تمام احادیث کے اس حصے کا ناسخ ہوگا جن میں مزارعت کی مطلقاً ممانعت آئی ہے۔ باقی رہا انھی روایات کا وہ حصہ جس میں زمین کو نقد لگان پر دینے سے منع کیا گیا ہے، تو یہ ممانعت علی حالہٖ قائم رہے گی، کیوں کہ ان کا ناسخ کوئی عمل یا حکم نہیں ملتا۔'' (المحلّٰی، جلد ۸، ص ۲۱۴)

پیداوار کے ایک حصہ کی صورت میں طے نہیں کیا جا سکتا جو کرایہ پر دی جا رہی ہو۔ ابن المنذِر رکھتا ہے کہ سونے اور چاندی کی شکل میں زمین کا کرایہ طے کرنے کے جواز پر تو تمام صحابہ متفق ہیں۔ اور ابنِ بطّال کہتا ہے کہ تمام فقہا امصار بھی اس کے جواز پر متفق ہیں۔ لیکن پیداوار کی بٹائی کے ناجائز ہونے پر مذکورۂ بالا اصحاب اُن احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو اس کی ممانعت میں وارد ہوئی ہیں اور خیبر کے معاملہ کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ خیبر تو بزورِ شمشیر فتح ہوا تھا اور اس کے باشندے آں حضرت ﷺ کے غلام ہو چکے تھے، اس لیے اس کی پیداوار میں سے جو کچھ بھی آپ نے لیا وہ بھی آپ ہی کا تھا اور جو کچھ چھوڑ دیا وہ بھی آپ ہی کا تھا۔ حازمی کہتا ہے کہ یہ مذہب عبداللّٰہ بن عمر اور عبداللّٰہ بن عباس اور رافع بن خدیج اور اسید بن حضیر اور ابو ہریرہؓ اور نافعؒ سے مروی[1] ہے اور اسی کی طرف مالکؒ اور شافعیؒ اور کوفیوں میں سے ابوحنیفہؒ گئے ہیں۔

امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ غلے اور ثمرے کے سوا ہر دوسری صورت میں زمین کا کرایہ طے کرنا جائز ہے۔ غلے اور ثمرے کی شکل میں کرایہ لینے سے وہ اس لیے منع کرتے ہیں کہ یہ معاملہ غلے سے غلے کی بیع نہ بن جائے اور ان کے نزدیک ممانعت کے احکام کا اصل منشا یہی ہے۔ فتح الباری کے مصنف نے ان کا مذہب اسی طرح نقل کیا ہے۔ مگر ابن المنذر کہتا ہے کہ امام مالک کے قول کا مطلب یہ لینا چاہیے کہ اگر کرایہ اس غلے میں سے طے ہو جو کرایہ پر دی جانے والی زمین سے پیدا ہوگا، تو یہ ناجائز ہے، رہی یہ صورت کہ کرایہ پر لینے والا شخص ایک مقرر مقدار غلہ ادا کرنے کا ذمہ لے یا موجودہ غلہ میں سے ادا کر دے تو اس کے جواز میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

امام احمدؒ بن حنبل کہتے ہیں کہ خود زمین ہی کی پیداوار میں سے ایک حصہ کرائے کے طور پر مقرر کرنا جائز ہے بشرطیکہ تخم مالکِ زمین کا ہو۔ امام احمدؒ کا یہ مذہب حازمی نے نقل کیا ہے۔''

(نیل الاوطار، جلد ۵، ص ۲۳۲)

حال میں **الفقه علىٰ المذاهب الاربعه** کے نام سے ایک نفیس کتاب مصر سے شائع ہوئی ہے جس میں اِسلامی فقہ کے چاروں مذاہب کے احکام نہایت عمدہ ترتیب اور تفصیل کے

[1] ان میں سے اکثر بزرگوں کی طرف اس مذہب کی نسبت صحیح نہیں ہے۔

ساتھ ان کی اصل کتابوں سے لے کر درج کیے گئے ہیں۔ اس کی تیسری جلد کے آغاز میں مزارعت کے مسئلے پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ ذیل میں ہم اس کا ایک ضروری خلاصہ درج کرتے ہیں تاکہ ہر شخص خود دیکھ لے کہ اس مسئلے میں فقہائے اِسلام کے مختلف مذاہب کا فتویٰ کیا ہے۔

مذہبِ حنفی کی تفصیل

''مزارعت'' (یعنی بٹائی) دراصل مالک زمین اور عامل (کاشت کار) کے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی رو سے یا تو عامل زمین کو اُجرت پر لیتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس کی زمین میں کاشت کرے گا اور پیداوار کا ایک حصہ مالک زمین کو اجرت میں دے گا، یا مالکِ زمین عامل کی خدمات اُجرت پر لیتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس کی زمین میں کام کرے گا اور پیداوار کا ایک حصہ اپنے کام کی اجرت میں پائے گا۔ اس نوعیت کا معاملہ حنفیہ میں مختلف فیہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ یہ ناجائز ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے۔ اور مذہبِ حنفی میں فتویٰ انھی دونوں بزرگوں کے قول پر ہے نہ کہ امام ابو حنیفہؒ کے قول پر، لیکن خود امام ابو حنیفہؒ بھی مزارعت کو مطلقاً ناجائز نہیں فرماتے، بلکہ اُن کے نزدیک اگر مالک زمین صرف زمین ہی دے کر الگ نہ ہو جائے بلکہ تخم اور ہل بیل وغیرہ میں بھی عامل کے ساتھ شریک ہو تو اس صورت میں پیداوار کی بٹائی پر معاملہ کرنا جائز ہے۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک (جس پر مذہب حنفی میں فتویٰ ہے) مزارعت کی جائز صورتیں یہ ہیں:

(۱) یہ کہ زمین ایک کی ہو اور تخم، آلاتِ زراعت اور عمل دوسرے کا ہو اور فریقین میں یہ قرارداد ہو جائے کہ زمین کا مالک پیداوار کا اتنا حصہ (مثلاً آدھا، تہائی یا چوتھائی) لے گا۔

(۲) یہ کہ زمین اور تخم اور آلاتِ زراعت سب کچھ مالک کا ہو اور صرف عمل دوسرے شخص کا ہو اور پھر یہ طے ہو جائے کہ عامل کو پیداوار میں سے اتنا حصہ ملے گا۔

(۳) یہ کہ زمین اور تخم مالک دے اور آلاتِ زراعت اور عمل دوسرے کا ہو، اور پھر بٹائی میں دونوں کے حصے کا تناسب طے ہو جائے۔

(۴) یہ کہ زمین بھی دونوں کی ہو، تخم بھی دونوں لائیں، آلات اور عمل میں بھی دونوں شریک ہوں اور پھر آپس میں حصے مقرر کرلیں۔

اور اس معاملہ کی ناجائز صورتیں یہ ہیں:

(۱) یہ کہ زمین دونوں فریقوں کی ہو، اور ایک فریق زمین کے ساتھ صرف بیج دے اور دوسرا فریق زمین کے ساتھ صرف ہل بیل دے۔ (بعض علما نے اس صورت کے جواز کا فتوٰی دیا ہے اگر کسی علاقے میں اس طریقے کا رواج عام ہو۔)

(۲) یہ کہ ایک کی زمین ہو، دوسرے کا تخم ہو، تیسرے کے ہل بیل ہوں اور چوتھے کا عمل ہو۔ یا ہل بیل اور عمل تیسرے کا ہو۔

(۳) یہ کہ تخم اور ہل بیل ایک کا ہو اور عمل اور زمین دوسرے کی ہو۔

(۴) یہ کہ زمین ایک کی ہو، اور تخم میں دونوں شریک ہوں، اور عمل کے بارے میں یہ شرط ہو کہ وہ مالکِ زمین کے سوا کوئی اور کرے گا۔

(۵) یہ کہ کسی ایک فریق کا حصہ مقدار کی شکل میں (مثلاً ۵۰ من یا ۱۰۰ من) معین کیا جائے، یا وہ بٹائی کے حصے کے علاوہ ایک خاص مقدارِ غلہ زائد لے، یا اس زمین کی پیداوار کے علاوہ کوئی اور جنس باہر سے فراہم کر کے دینے کی ذمہ داری کسی فریق پر ڈالی جائے۔

مذہبِ حنبلی

حنابلہ کا مذہب اس معاملہ میں تقریباً وہی ہے جو امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس بات کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ تخم مالکِ زمین مہیا کرے۔

لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعد میں مذہبِ حنبلی کے علما نے اس شرط میں کچھ ترمیم کر دی۔ چنانچہ آگے چل کر جہاں **الفقه على المذاهب الاربعة** کا مصنف مذہب حنبلی کے تفصیلی احکام بیان کرتا ہے، وہاں وہ کہتا ہے:

''صحیح یہ ہے کہ تخم کا مالک زمین کی طرف سے ہونا شرط نہیں ہے۔ دراصل شرط یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک کچھ رأس المال دے۔ پس یہ صورت بھی صحیح ہے کہ ایک شخص

صرف زمین دے اور دوسرا شخص تخم اور عمل اور آلاتِ زراعت کے ساتھ شریک ہو اور یہ بھی درست ہے کہ تخم یا ہل بیل یا دونوں مالکِ زمین کے ذمہ ہوں اور دوسرے کے ذمہ عمل اور تخم یا عمل اور ہل بیل ہوں۔'' (ص ۲۱)

مذہبِ مالکی

مالکیہ کے نزدیک مزارعت کی یہ صورت جائز نہیں ہے کہ ایک شخص زمین دے، اور دوسرا تخم اور عمل اور آلات کے ساتھ شریک ہو اور پیداوار کو دونوں فریق طے کسی شدہ تناسب کے مطابق آپس میں بانٹ لیں۔ اس کی بجائے مزارعت کی جو شکل وہ تجویز کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ زمین، عمل، اور آلاتِ زراعت میں سے ہر ایک کی ایک قیمت روپے یا اموالِ تجارت (باستثناء غلہ) کے حساب سے مشخص کی جائے۔ مثلاً یہ کہ زمین کو اتنی مدت تک استعمال کرنے کی قیمت پچاس روپے یا اتنے گز کپڑا ہے۔ اور اس مدت کے دَوران میں جو زراعت کا عمل اس پر کیا جائے گا اس کی قیمت اتنے روپے یا اتنا کپڑا ہے۔ اور اس مدت میں آلاتِ زراعت جن سے کام لیا جائے گا ان کے استعمال کی قیمت اس قدر ہے۔ پھر جو فریق ان میں سے جس جس چیز کے ساتھ شریک ہو گا اس کے متعلق یہ قرار دیا جائے گا کہ وہ گویا اتنے سرمایہ کے ساتھ اس مشترک کاروبار میں حصہ دار بن رہا ہے۔ مگر تخم لازمًا دونوں فریق برابر برابر لائیں گے اور جو کچھ منافع اس مشترک کاروبار سے حاصل ہو گا وہ اس سرمایہ کی نسبت سے فریقین کے درمیان تقسیم ہو جائے گا، جس کے ساتھ وہ شریک ہوئے ہیں۔

مذہبِ شافعی

شافعیہ کے نزدیک بٹائی کی تمام صورتیں ناجائز ہیں خواہ بیج اور زمین مالک دے یا بیج اور عمل کاشت کار کا ہو۔ ان کا خیال یہ ہے کہ زمین کی اُجرت خود اسی زمین کی پیداوار میں سے مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں کاشت کار یہ جانے بغیر عمل کرتا ہے کہ اس کے حصے میں کتنا غلہ آئے گا، اس لیے یہ دھوکے کا سودا ہے۔ اس کے بجائے صحیح صورت یہ ہے کہ یا تو مالکِ زمین کاشت کار کی خدمات ایک مقرر اُجرت پر حاصل کرے اور کھیتی مالک کی ہو، یا پھر

کاشت کار ایک مقرر اُجرت پر مالک سے زمین لے لے اور کھیتی کاشت کار کی ہو۔ یہ صاف صاف معاملہ کرنے کی بجائے ایسا معاملہ کیوں کیا جائے جس میں فریقین کو کچھ معلوم نہ ہو کہ ان کے حصے میں کتنا کچھ غلہ آئے گا؟ شافعیہ کا کہنا یہ ہے کہ احادیث میں مخابرۃ اور مزارعت کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے۔

لیکن شافعیہ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ ایک شخص اپنا باغ دوسرے کو رکھوالی کے لیے دے اور اس کے عمل کی اجرت مقرر کرنے کے بجائے ثمرے میں سے اس کا حصہ طے کرے۔ نیز ان کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ اگر باغ میں کچھ زمین زراعت کے لیے فارغ ہو تو اسی باغ بان کو اس میں زراعت کی بھی اجازت دے دی جائے اور باغ کا مالک اس کی پیداوار میں سے اپنا حصہ بٹائی کے طریقہ پر طے کرے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ مزارعت بجائے خود ایک مستقل معاملہ کے طور پر نہ ہو بلکہ اسی باغ بانی کے معاملہ میں شامل اور اس کی تابع ہو، اور اسی شخص کے ساتھ طے ہو جس سے باغ بانی کا معاملہ کیا گیا ہے۔

ان تفصیلات پر نگاہ ڈالنے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ فرقۂ ظاہریہ کی ایک ذرا سی جماعت کو چھوڑ کر پوری امت کے ماہرینِ قانون میں سے کسی کا بھی یہ مسلک نہیں ہے کہ زرعی جائداد کی ملکیت کو صرف خود کاشتی کی حد تک محدود ہونا چاہیے، یا یہ کہ خود کاشتی کی حد سے زائد جتنی زمین آدمی کے پاس ہو اسے مفت دینے یا ڈال رکھنے کے سوا کوئی تیسری صورت اس کے استعمال کی شریعت میں نہیں ہے۔ زائد زمین کی کاشت دوسروں سے کرانے کی کیا صورت جائز ہے اور کیا ناجائز، اس میں تو ضرور مختلف مذاہب کے درمیان اختلاف ہے، مگر فقہ کے ہر مذہب میں کوئی نہ کوئی صورت ایسی ضرور جائز ہے جس سے ایک آدمی اپنی زمین کی کاشت دوسرے سے کرا سکتا ہے۔

.....☆☆☆.....

۴

اِصلاح کے حدود اور طریقے

کوئی شک نہیں کہ زمین کا موجودہ بندوبست نہایت ناقص اور غیر منصفانہ ہے۔ بلاشبہ زمین داری اور جاگیر داری اس قدر خرابیوں سے لبریز ہو چکی ہے کہ ہماری پوری معیشت اور معاشرت اس کے زہر سے متاثر ہو رہی ہے۔ اصلاح کی ضرورت یقیناً ہے اور بجائے خود اس معاملہ میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس بگاڑ کو دُور ہونا چاہیے لیکن جو لوگ اصلاح کا نام لیتے ہیں انھیں باہر کے بگاڑ کی فکر کرنے سے پہلے اپنے اندر کے بگاڑ کی فکر کرنی چاہیے، کیوں کہ ایک ناصاف اور الجھے ہوئے ذہن کو لے کر اگر وہ باہر کے بگاڑ کی فکر کرنے سے پہلے اپنے اندر کے بگاڑ کی فکر کرنی چاہیے، کیوں کہ ایک ناصاف اور الجھے ہوئے ذہن کو لے کر اگر وہ باہر اصلاح کی قینچی چلانا شروع کریں گے تو پچھلی خرابیوں کو دور کرنے کی بجائے نئی خرابیوں کا ایک اور گورکھ دھندا پیدا کر دیں گے۔

سب سے پہلے تو انھیں یہ طے کرنا چاہیے کہ ان کا کوئی دین ہے یا نہیں، اور ہے تو وہ اِسلام ہے یا کچھ اور؟ اگر ان کا کوئی دین نہ ہو، یا ہو مگر وہ اِسلام کے سوا کچھ اور ہو، تو انھیں پورا حق ہے کہ اصلاح کے لیے اپنا کوئی طبع زاد نظریہ پیش کریں یا کہیں اور سے کوئی نظریہ اخذ کریں اور اسے رائج کرنے کی کوشش شروع کر دیں۔ مگر یہ سب کچھ بہر حال انھیں اپنے ہی نام سے کرنا چاہیے، یا اپنے اس پیشوا کے نام سے جس کی وہ پیروی کر رہے ہوں

یہ حق انھیں کسی طرح بھی نہیں پہنچتا کہ اپنی من گھڑت یا دوسروں کی ایجاد کردہ تجویزوں کو زبردستی کھینچ تان کر اِسلام کے سر منڈھیں اور اس کے نام سے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش

کریں۔ اور اگر وہ اپنا کوئی دین رکھتے ہوں اور وہ اِسلام ہی ہو، لیکن وہ عملاً اس کی پیروی نہ کرنا چاہتے ہوں، تب بھی انھیں معصیت کا اختیار تو ضرور حاصل ہے مگر کم از کم معقولیت کے حدود میں تو اس کی گنجائش نہیں کہ اِسلام سے ہٹ کر اور اسے نظر انداز کر کے جو تجویزیں وہ خود گھڑیں یا کہیں اور سے لائیں انھیں خواہ مخواہ عین اِسلام قرار دیں۔

پھر اگر وہ یہی طے کریں کہ فی الحقیقت ان کا ایک دین ہے اور وہ اِسلام ہی ہے اور انھیں اس کی پیروی بھی کرنی ہے، تو اِسلام کے نام پر کوئی اصلاح شروع کرنے سے پہلے انھیں چند ابتدائی باتیں ضرور جان لینی چاہییں۔ انھیں جاننا چاہیے کہ اِسلام نے محض عدل و انصاف کے الفاظ ہی ہمیں نہیں دیے ہیں بلکہ ان کے مفہومات، تصورات اور عملی نقشے بھی ساتھ کے ساتھ دے دیے ہیں، لہٰذا اگر ہم اِسلامی انصاف قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں صرف انصاف کا لفظ ہی اِسلام کی لغت سے نہ لینا ہوگا بلکہ اس کا تصور اور اس کا عملی نقشہ بھی اِسلام ہی کے قانون سے لینا پڑے گا۔ ان کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ اِسلام کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اس کے نظام، اُصول اور قوانین کو سمجھنے میں اپنی عمر کا کوئی ذرا سا حصہ بھی صرف نہ کیا ہو وہ اِدھر اُدھر سے چند آیات اور چند احادیث جمع کر کے چند گھنٹوں کے اندر بڑے بڑے دینی مسائل کے مجتہدانہ فیصلے کر ڈالیں اور اُلٹا ان لوگوں کو احمق بنانے کی کوشش کریں جنھوں نے اپنی عمریں اس دین کے نظام اور احکام کو سمجھنے میں کھپا دی ہیں۔ یا چند نواب زادے اور چند وکیل اور بیرسٹر صاحبان بیٹھ کر سراسر دنیوی اغراض اور مصلحتوں کی بنیاد پر ایک اصلاحی اسکیم تصنیف کریں اور پھر اِسلام کے نام سے اس کو محض پیش کر دینے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ دھڑلے کے ساتھ یہ بھی فرما دیں کہ جو مولوی اور ملا اس کے مطابق فتویٰ دے بس وہی دین کو جانتا ہے۔ یہ محض جہالت ہی نہیں، جہل مرکب ہے۔ اس طرح کے مصلحین کو جاننا چاہیے کہ یہ رویہ کسی معقول آدمی کو زیب نہیں دیتا۔ انھیں جاننا چاہیے کہ اِسلام ایک باقاعدہ نظام ہے جو اپنا ایک مستقل فلسفۂ زندگی، اپنے جامع اور ہمہ گیر اصول اور اپنے مخصوص ضوابط اور قوانین رکھتا ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کا علم حاصل کیے بغیر جو کچھ چاہے اپنے دل سے گھڑ کر یا دوسری جگہ سے لا کر اس کے نظام میں کھپا دے، یا ایک سرسری سی واقفیت کے بل بوتے پر مجتہد مطلق بن بیٹھے اور اپنے ذہن کی خام پیداوار کو قطعی اور حتمی فیصلوں کی

صورت میں برآمد کرنا شروع کر دے۔ اُنھیں جاننا چاہیے کہ موجودہ خرابیوں کی اصلاح اور ایک نئے صالح نظام کی تاسیس اگر ہم خود اپنی صواب دید سے کریں تو اسے اِسلام کی طرف سے منسوب کرنا غلط ہے، اور اگر یہ کام ہمیں اِسلام کے طریقے پر کرنا ہو تو لامحالہ ہمیں کو ساری اصلاح و تاسیس اُن حدود کے اندر کرنا ہوگی جو اِسلام نے مقرر کی ہیں اور اُن اُصولوں کے مطابق کرنا ہوگی، جو اُس نے ہمیں دیے ہیں۔

ان پہلوؤں سے اگر لوگ اپنے ذہن کو صاف کر لیں اور ہر شخص اور گروہ اپنے حدودِ کار کو پہچان کر اپنی کارفرمائی اور کارگزاری کو اپنی اہلیت کی حد تک محدود رکھے تو بہت سی وہ اُلجھنیں دُور ہو جائیں جن کی وجہ سے کام بننے کی بجائے اُلٹا بگڑ رہا ہے۔

اِصلاح کے حدودِ اربعہ

اس کے بعد جو لوگ فی الحقیقت اِسلامی اصلاح چاہتے ہیں اور من مانی کارروائیاں نہیں کرنا چاہتے ان کی سہولت کے لیے ہم ان صفحات میں اختصار کے ساتھ یہ واضح کریں گے کہ اِسلامی قانون نے وہ کون سے حدود کھینچ رکھے ہیں جن کے اندر ہماری اصلاحی تدبیروں کو محدود رہنا چاہیے، اُن حدود کے اندر کیا کچھ کرنے کی گنجائش ہے اور کیا کچھ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

۱۔ قومی ملکیت کی نفی

سب سے پہلی چیز جو تمام اصلاح طلب عناصر کو صاف صاف سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اِسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اِسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے ہی قدم پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اِسلام زبردستی مالکانِ زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جا سکے، بلکہ درحقیقت

اِسلامی نظریۂ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکم ران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو اِن ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں اُنھی ہاتھوں میں اگر سوداگری، کارخانہ داری اور زمین داری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کُش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقوں سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے تو اِسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں، جزئیاتِ شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو، مگر کلیاتِ شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدلِ اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے نہ کہ اِسلامی تصور۔ اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ اِسلامی معاشرہ۔ اِسلامی معاشرہ کے لیے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے افراد سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔

۲۔ تقسیمِ دولت میں مساوات کی نفی

دوسرے چیز جو ہمارے اصلاح طلب حضرات کے ذہن نشین ہونی چاہیے یہ ہے کہ اِسلام دولت کی مساویانہ تقسیم کا قائل نہیں ہے بلکہ منصفانہ تقسیم کا قائل ہے اور اس منصفانہ تقسیم کے لیے بھی وہ انصاف کا اپنا ہی ایک مخصوص تصور رکھتا ہے۔ جہاں تک مساویانہ تقسیم کا تعلق ہے وہ محض ایک خیالی جنت ہے جس کا متحقق ہونا نظامِ فطرت میں کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ فطرت کے قوانین ہی کچھ اس طرح کے ہیں کہ اگر کسی وقت مصنوعی طور پر دولت کو سب انسانوں کے درمیان برابر برابر تقسیم کر بھی دیا جائے تو اُسی آن سے یہ مساوات عدمِ مساوات میں تبدیل ہونا شروع ہو جائے گی یہاں تک کہ تھوڑی مدت گزرنے کے بعد اس مصنوعی مساوات کا کہیں نام و نشان تک باقی نہ

رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مساویانہ تقسیم کا نام لے کر اٹھے تھے انھیں بھی آخر کار اس خیال سے باز آ جانا پڑا۔ اِسلام اس طرح کی خام خیالیوں سے بہت بالا و برتر ہے۔ وہ تقسیم دولت میں مساوات کی بجائے انصاف قائم کرنا چاہتا ہے، اور اس انصاف کی ایک واضح اور مکمل صورت اس نے اپنے قوانین میں، اپنی اَخلاقی ہدایات میں، اور اپنے معاشرے کی تشکیل میں قائم کر دی ہے۔ لہٰذا اگر ہم اِسلامی طرز پر اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے ہی قدم پر ایسی تمام تجویزوں کو رد کر دینا چاہیے جن کا مقصود کسی قسم کی مصنوعی مساوات کا قیام ہو، اس کی بجائے ہماری اصلاحی تدبیروں کے لیے صحیح سمت یہ ہے کہ ہم انصاف کے اِسلامی نقشے کو سمجھیں اور اپنے نظامِ معیشت و معاشرت میں اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔

۳۔ جائز حقوقِ ملکیت کی حرمت

تیسرا اہم نکتہ جس سے ہمارے اصلاح طلب بھائیوں کو غافل نہ رہنا چاہیے یہ ہے کہ اِسلام کمیونزم کی طرح کا کوئی بگ ٹُٹ بے لگام فلسفۂ زندگی نہیں ہے کہ چند آدمی بیٹھ کر اپنی جگہ اجتماعی فلاح و بہبود کا ایک خاص نظریہ قائم کریں اور پھر اندھا دُھند طریقے سے ہر طرح کی جائز و ناجائز تدبیروں سے زبردستی اسے دُوسروں پر مسلط کرنا شروع کر دیں، وہ نہ کسی طبقے کے اغراض و مفاد کا وکیل ہے نہ کسی دوسرے طبقے کے غصے اور جھنجھلاہٹ کا ترجمان۔ اس کی بنیاد خدا ترسی، عدل اور حق شناسی پر قائم ہے اور انھی بنیادوں پر وہ انسانی زندگی کا نظام اُستوار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے نظام میں اس طرح کی باتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ آپ اصلاح کے نام سے جس کے حقوق پر چاہیں دست درازی کر بیٹھیں، جس سے جو کچھ چاہیں چھین لیں اور جسے جو کچھ چاہیں دلوا دیں۔ ایک غیر ذمہ دار آدمی جو کسی خدا کا قائل نہ ہو اور جسے کسی کو حساب نہ دینا ہو، بے تکلف یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ہم تمام زمین داریوں اور جاگیرداریوں کو مٹا دیں گے اور یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ہم ان سب کو جوں کا توں قائم رکھیں گے۔ لیکن ایک مسلمان جو خدا ترسی کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے اور حدود اللّٰہ کا پابند ہے، ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتا۔ اسے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ خدا کی شریعت کی رُو سے کون جائز طور پر کسی چیز کا مالک ہے اور کس کی ملکیت جائز نہیں ہے۔ کون خدا اور

رسول کے دیے ہوئے حقوق سے صحیح طور پر متمتع ہو رہا ہے اور کون اپنے جائز حقوق کی حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ پھر جائز و ناجائز کی پوری تمیز ملحوظ رکھتے ہوئے وہ تمام جائز شرعی ملکیتوں کو قائم رکھے گا اور صرف ان ملکیتوں کو ختم کرے گا جو ناجائز نوعیت کی ہیں۔

۴۔ من مانی قیود کا عدمِ جواز

آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اِسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر اصولاً نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں۔ اِسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسکے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے، جائز طریقے پر استعمال ہو، جائز راستوں میں جائے، اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کیے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اُسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو، اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے جسے تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعہ سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں، مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی خاص ضرورت کی بِنا پر کچھ کیا جا سکتا ہے تو وہ ایک عارضی پابندی ہے جسے ہم آگے بیان کر رہے ہیں، مگر وہ اِسلامی قانون میں کسی مستقل اُصولی ترمیم کا موجب نہیں ہو سکتی۔

تدابیرِ اِصلاح

یہ ہیں وہ سرحدیں جنھیں پار کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اصولِ اِسلام کے مطابق ہم کس قسم کی اصلاحی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں جن سے زمین کے انتظام کی موجودہ خرابیاں دور ہوں اور وہ انصاف قائم ہو سکے جو اِسلامی معیار کے لحاظ سے مطلوب ہے۔

۱۔ زمین داری و جاگیرداری کا معاملہ

ہمارے ملک میں یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کہ بعض جگہ بہت بڑے بڑے رقبے جو ہزاروں سے گزر کر لاکھوں ایکڑ تک بھی وسیع ہیں، کچھ خاندانوں کے پاس جاگیر یا زمین داری کے طور پر مدتوں سے چلے آ رہے ہیں۔ اُن میں سے بعض وہ ہیں جو انگریزی حکومت نے ملک پر قابض ہونے کے بعد غداریوں کے صلے میں اصل حق داروں سے چھین کر دیے تھے۔ بعض انگریزی دَور سے بھی پہلے مختلف زمانوں میں جا و بے جا طریقوں سے موجودہ مالکوں کے اسلاف کو عطا کیے گئے تھے۔ بعض جزوی یا کلی طور پر خریدے بھی گئے تھے اور بعض ایسے بھی تھے کہ سردارانِ قبائل نے گزشتہ صدیوں میں کسی وقت ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان سب کے متعلق آج یہ تحقیق کرنا سخت مشکل ہے کہ کس کی ملکیت کس طرح شروع ہوئی، اور آیا وہ شرعًا جائز نوعیت کی تھی یا ناجائز نوعیت کی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اتنے بڑے بڑے رقبوں کی ملکیت سے، جن سب کا جائز ہونا بھی متحقق نہیں ہے، ہمارے نظامِ معیشت میں سخت ناہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ اس حالت میں شرعًا یہ دُرست ہو گا کہ ایک عارضی تدبیر کے طور پر ملکیت کی ایک حد مقرر کر دی جائے، اور اس حد سے زائد جو رقبے لوگوں کے پاس ہوں انھیں ایک منصفانہ شرح سے خرید کر آگے غیر مالک کاشت کاروں کے ہاتھ منصفانہ شرح پر فروخت کر دیا جائے۔ لیکن یہ حد بندی نہ تو دائمی ہو سکتی ہے، کیوں کہ اسے شریعت کے بہت سے قواعد کو بدلے بغیر مستقل بنانا ممکن نہیں ہے، اور نہ اسے دائمی قانون بنا دینے کی کوئی ضرورت ہے، کیوں کہ آیندہ کے لیے اگر اِسلام ملک کا قانون ہو اور اس کے مطابق عملدرآمد ہونے لگے تو سرے سے وہ خرابیاں ہی پیدا نہیں ہو سکتیں جن کے لیے ایسی حد بندی کی کوئی ضرورت ہو۔

۲۔ قانونی زراعت پیشگی کا خاتمہ

ثانیاً ایسے تمام قوانین کا خاتمہ ہونا چاہیے جن کی بدولت قانونی طور پر ایک مستقل ''زراعت پیشہ طبقہ'' پیدا کر دیا گیا ہے، دیہاتی معاشرت میں معاشی اور معاشرتی حیثیت سے اس کے امتیازی حقوق قائم کر دیے گئے ہیں، اور ''غیر زراعت پیشہ'' طبقوں کے لیے زراعت پیشگی کے دائرے میں قدم رکھنا حرام کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے، غیر معقول ہے، اور اُن بے شمار بے انصافیوں کا سرچشمہ ہے جو ''نظامِ جاگیرداری'' کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں۔ زرعی جائدادوں کی خرید و فروخت پر سے تمام پابندیاں اُٹھ جانی چاہییں۔ دوسری سب املاک کی طرح، اور خود شہری زمینوں کی طرح دیہاتی زمینیں بھی کھلے بندوں قابلِ بیع و شرا ہونی چاہییں۔ شُفعہ کے قوانین نے جو قطعی غیر اسلامی اور انتہا درجہ غیر معقول اور سخت مخربِ اَخلاق صورت اختیار کر لی ہے اسے منسوخ ہونا چاہیے۔ زراعت کا پیشہ تمام دوسرے پیشوں کی طرح ہر بندۂ خدا کے لیے کھلا رہنا چاہیے۔ اور گاؤں کی زندگی میں زمین دار کو از روئے قانون ایسی کوئی حیثیت حاصل نہ ہونی چاہیے جس کی بدولت دوسرے سب اس کی رعیت اور اس کے دبیل بن کر رہنے پر مجبور ہوں۔

۳۔ زرعی قوانین کی تدوینِ جدید

ثالثاً ایک ایسا زرعی قانون بننا چاہیے جس کے ذریعہ سے مالکانِ زمین اور غیر مالک کاشت کاروں کے باہمی تعلق کو صحیح اور منصفانہ بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ مزارعت (بٹائی) ہو تو اسے بالکل سیدھی سادی شرکت کے اصول پر قائم ہونا چاہیے اور از روئے قانون یہ طے ہو جانا چاہیے کہ مزارعت کی کن کن صورتوں میں مالک اور مزارع کے درمیان زیادہ سے زیادہ اور کم از کم کس کس نسبت سے حصہ تقسیم ہو سکتا ہے۔ نقد کرایہ ہو یا مزدوری پر کاشت کرائی جائے تو اس میں بھی مالک اور مستاجر کے درمیان، اور مالک اور مزدور کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین ہو جانا چاہیے[1]۔ یہ بھی طے ہونا چاہیے کہ مالکانِ زمین کاشت کاروں سے اپنے حصے یا لگان کے علاوہ کوئی

[1] اگرچہ ان امور کو شریعت نے عرف اور باہمی قرارداد پر چھوڑ دیا ہے، لیکن جہاں ظلم کی غیر معمولی صورتیں پیدا ہو گئی ہوں ایسی جگہ اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ انصاف قائم کرنے کے لیے ایسے امور میں مداخلت کرے اور واضح احکام مدوّن کر کے ظلم کی روک تھام کر دے۔

مال یا غلہ یا خدمات لینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ ناجائز طور پر اس طرح کی خدمات یا اشیا یا زبردستی کے جمائے ہوئے رسمی حقوق وصول کرنے کو جرم قابلِ دست اندازی پولیس ہونا چاہیے۔ بے دخلی اور فسخِ معاملہ کے متعلق بھی قواعد مقرر ہونے چاہییں کہ وہ کن کن صورتوں میں ہوسکتی ہیں اور کن کن صورتوں میں نہیں ہوسکتیں۔ نیز زمین کو بے کار ڈال رکھنے پر بھی شریعت کے احکام اور اسپرٹ کے مطابق پابندیاں عائد ہونی چاہییں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، جہاں تک موات اور حکومت کی عطا کردہ زمینوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو خود احکامِ شریعت ہی میں یہ تصریح ہے کہ تین سال سے زیادہ مدت تک اگر آدمی انھیں بے کار ڈال رکھے تو اس کے حقوق سوخت ہوجاتے ہیں۔ رہیں زرخرید زمینیں تو انھیں اُفتادہ چھوڑ دینے سے اگرچہ ملکیت ساقط نہیں ہوسکتی، لیکن اس پر ایسا کوئی تعزیری محصول ضرور لگایا جاسکتا ہے جس سے مالکانِ زمین کا یہ میلان کم ہوسکے کہ وہ کاشت کاروں سے من مانی شرطیں تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کاشت کار نہیں مانتے تو اپنی زمین کو بے کار رکھ چھوڑنا زیادہ پسند کرتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ کسی بندۂ خدا کو اس پر کام کرنے کا موقع دیں۔

۴۔ شرعی طریقے پر تقسیمِ میراث

رابعًا شریعت کے قانونِ میراث کو زرعی جائدادوں کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ موجودہ نسل ہی میں جو لوگ شرعًا حق دار ہیں اگر ان کے اندر میراث کی تقسیم کو لازم کر دیا جائے تو بہت سی وہ بڑی بڑی جائدادیں جو پرانے جاہلی رواج کی وجہ سے یک جا سمٹی ہوئی ہیں، مستحقین میں بٹ جائیں گی اور دولت کے پھیلاؤ کا سلسلہ چل پڑے گا۔ اس صورت میں جو اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ زمین اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو جائے گی جو معاشی حیثیت سے قابلِ عمل نہ رہیں گے یہ درحقیقت صحیح نہیں ہے۔ آپ زمین کی خرید و فروخت سے بے جا رُکاوٹیں ہٹا دیجیے۔ مزارعت کے لیے عمدہ اور واضح طریقے مقرر کر دیے اور ''مشترک کاشت'' (کوآپریٹو فارمنگ) کے طریقوں کو رواج دیجیے۔ اس کے بعد چاہے قانونِ میراث کی بدولت، زمین تقسیم در تقسیم ہو کر ایک ایک گز کے ٹکڑوں ہی میں کیوں نہ

بٹ جائے ایسی صورتِ حال کبھی پیدا نہ ہونے پائے گی جس میں یہ حصے ناقابلِ عمل ہو کر رہ جائیں۔ جن لوگوں کے پاس اس طرح کے چھوٹے ٹکڑے رہ جائیں گے وہ بآسانی اپنا حصہ بیچ سکیں گے، یا دوسروں کے حصے خرید سکیں گے، یا مناسب شرائط پر کاشت کے لیے دے سکیں گے، یا مشترک کاشت میں شریک ہو جائیں گے۔

۵۔ عشر کی تحصیل و تقسیم کا نظم

خامساً شریعت کے احکام کے مطابق اس امر کا انتظام ہونا چاہیے کہ زرعی پیداوار کا عشر اور زمین داروں کے مواشی کی زکوٰۃ باقاعدہ وصول ہو اور اسے شرعی مصارف میں صرف کیا جائے۔ اس کے مفصل احکام ان شاءاللہ ہم اپنے رسالہ زکوٰۃ میں عن قریب بیان کریں گے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ اسلامی معیار کے مطابق انصاف قائم کرنے، اور قوم کے مختلف طبقات میں عداوت و نزاع کی بجائے اُلفت و موافقت پیدا کرنے کے لیے یہ ایک ضروری تدبیر ہے جس کے فوائد کسی دوسری تدبیر سے حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

یہ ہے وہ اصل رُخ جس کی طرف ہماری اصلاحی کوششوں کو مڑنا چاہیے۔ مَیں نے اس جگہ تمام ممکن تدابیر کا استقصا نہیں کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صاحبِ علم اور تجربہ کار اصحاب اس پر مزید تجویزوں کا اضافہ کریں۔ میرا مدعا یہاں صرف یہ دکھانا تھا کہ اصلاحِ احوال کی مساعی کا صحیح رُخ وہ نہیں ہے جس کی طرف قلم اور قدم چل پڑے ہیں، بلکہ یہ ہے جس کی طرف اِسلام ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِی اِلَّا بِاللّٰہِ ط

.....☆☆☆.....